رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے تمام اہم واقعات اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ کی صداقت کا ایک زندہ ثبوت پیش کرتے ہیں

از

سیدنا حضرت میرزا بشیر الدین محمود احمد
خلیفۃ المسیح الثانی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ نَحۡمَدُہٗ وَ نُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے تمام اہم واقعات کہ اَلَیۡسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبۡدَہٗ کی صداقت کا ایک زندہ ثبوت پیش کرتے ہیں

(فرمودہ ۱۷؍ جون ۱۹۴۷ء)

تشہد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:۔

ہمارے سلسلہ میں اَلَیۡسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبۡدَہٗ[1] والی آیت جو سورۂ زمر میں آتی ہے اور جس کے اوّلین مخاطب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ایک بہت بڑی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ یہ الہام حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اُس وقت نازل ہوا جب آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے والد ماجد کی وفات کی خبر ملی اور آپ کے دل میں خیال گزرا کہ ان کی وفات کے بعد آپ کے گذارہ کی کیا صورت ہوگی۔ آپ فرماتے تھے کہ اس خیال کے آتے ہی یہ الہام ہوا کہ اَلَیۡسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبۡدَہٗ یعنی کیا خدا اپنے بندے کے لئے کافی نہیں؟ آپ نے اپنی کتابوں میں تحریر فرمایا ہے کہ اس الہام کے بعد اللہ تعالیٰ میرا ایسا متکفل ہوا کہ کہیں کسی کا باپ بھی ایسا متکفل نہیں ہوسکتا اور اُس نے مجھ پر وہ احسانات فرمائے جن کا میں شمار تک نہیں کرسکتا۔ اس کے بعد آپ نے اُنہی دنوں اِس الہام کو ایک نگینہ میں کھدوا کر اُس کی انگوٹھی بنوائی جو اَب تک ہمارے خاندان میں محفوظ چلی آرہی ہے۔ پس چونکہ یہ آیت ہمارے سلسلہ کے ساتھ نہایت گہرا تعلق رکھتی ہے اِس لئے ہماری جماعت کا قریباً ہر فرد

اس سے واقف ہے لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ عَبْدَ کے ساتھ ہٗ کی اضافت واضح طور پر بتا رہی ہے کہ اس جگہ ہر وہ شخص مخاطب ہے جو اللہ تعالیٰ کا حقیقی عبد بن جائے اور یہ ایک حقیقت ہے جس کا کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ اللہ تعالیٰ علیٰ قدرِ مراتب اپنے ہر عبد کی خبر گیری کرتا اور اس کی ضروریات کو پورا فرماتا ہے۔ پس یہ ایک ایسا وعدہ ہے جو غیر معیّن ہے اور جس کے معنی یہ ہیں کہ جو بھی اللہ تعالیٰ کا عَبْد ہوگا وہی اِس آیت کا مخاطب ہوگا چاہے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہوں، حضرت موسیٰ علیہ السلام ہوں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہوں یا ان سے اُتر کر صدیقین، شہداء اور صالحین وغیرہ ہوں یعنی جو بھی خدا تعالیٰ سے تعلق رکھنے والا عَبْد ہو وہی اِس آیت کا مخاطب ہوگا اور اللہ تعالیٰ علیٰ قدرِ مراتب اپنے سارے عِبَاد سے حسنِ سلوک فرماتا رہے گا۔ جتنا اعلیٰ عبد ہوگا اُتنا ہی اعلیٰ خدا تعالیٰ بھی اُس سے حسنِ سلوک کرے گا اور جتنا ادنیٰ عبد ہوگا اتنا ہی کم اللہ تعالیٰ بھی اس کے ساتھ حسنِ سلوک کرے گا۔

میں نے دیکھا ہے بعض دفعہ اللہ تعالیٰ اتنے چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی اپنے بندے کی خبر گیری کرتا ہے کہ دیکھ کر حیرت آتی ہے کہ اتنی خبر گیری تو قریبی سے قریبی رشتہ دار بھی ضرورت پڑنے پر نہیں کیا کرتے۔ ادھر منہ سے ایک چھوٹی سے بات نکلتی ہے اور ادھر پوری ہو جاتی ہے، بعض دفعہ کسی آدمی کے متعلق خیال کیا جاتا ہے تو وہ جھٹ آ پہنچتا ہے اور بعض دفعہ کسی چیز کے متعلق خیال کیا جاتا ہے تو وہ جھٹ مل جاتی ہے۔ ابھی اترسوں کا ذکر ہے کہ ایک ایسی بات ہوئی جس کو میرے چھوٹے بچے نے بھی محسوس کیا حالانکہ چھوٹے بچوں میں کسی اہم بات کے احساس کا شعور نہیں ہوتا وہ بات یہ تھی کہ میں نے کہا کہ اِس دفعہ آم ابھی تک نہیں آئے اِس پر ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ ایک آدمی سندھ سے آ پہنچا اور اُس کے پاس ہمارے لئے آم تھے۔ میری بیوی نے مجھ سے ذکر کیا کہ بچہ کہہ رہا ہے کہ لو ابھی ابھی ابّا جان نے کہا تھا کہ اِس دفعہ آم نہیں آئے اور وہ آ بھی گئے ہیں۔ یہ بات اگر ایک دفعہ ہوتی تو اِس کو اتفاقی کہہ سکتے تھے لیکن اِس قسم کی ہزاروں باتیں اتنے تواتر کے ساتھ ہوتی ہیں اور ان کو اتفاقی نہیں کہا جا سکتا۔ پس یہ آیت حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، یا کسی اور نبی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے سارے بندوں کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے سارے بندوں کے

ساتھ ہی علیٰ قدرِ مراتب حسن سلوک کرتا ہے مگر ہاں یہ آیت اپنی اس شکل میں چونکہ سب سے پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی ہے اس لئے اس کا سب سے اعلیٰ اور ارفع ظہور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات پر ہی ہوا ہے۔اور ہم دیکھتے ہیں کہ یہ آیت تو آپ پر بعد میں اُتری مگر آپ کی ساری زندگی ہی اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ کا نمونہ نظر آتی ہے۔

اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ کا صرف ایک ہی پہلو نہیں بلکہ دو پہلو ہیں اور اس کے اندر دو نہایت عظیم الشان پیشگوئیاں ہیں۔ایک یہ کہ آپ کو بہت زیادہ خطرات پیش آئیں گے اور دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ ہر خطرہ کے وقت آپ کی حفاظت کرے گا کیونکہ حفاظت کی ضرورت تبھی ہوتی ہے جب کوئی خطرہ درپیش ہو۔اگر کوئی خطرہ نہ ہو تو حفاظت اور مدد کے معنی ہی کچھ نہیں ہوتے۔پس اللہ تعالیٰ اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ میں فرماتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی خطرات سے پُر ہوگی مگر ہر خطرہ کے موقع پر میں اس کی حفاظت کروں گا اور یہ دونوں چیزیں متوازی ہوں گی۔ایک شخص جس کے پاس بچپن میں ہی بے شمار مال و دولت آ جائے، طاقت آ جائے، اُس کے نوکر چاکر موجود ہوں، اُس کو پڑھانے والے بڑے بڑے عالم موجود ہوں، اُس کی عالیشان کوٹھیاں ہوں، موٹر کاریں ہوں، اُس کی عمارات اور ساز و سامان کو دیکھ کر لوگ اُسے لڑکیاں دینے کے لئے تیار ہوں، اس کی مجلس میں بیٹھنے والے دوست موجود ہوں اور ہر وقت اُس کے پاس عیش و عشرت کی محفلیں منعقد ہوں اُس کو خدا تعالیٰ کی نعمتوں اور انعامات کی قدر نہیں ہوتی۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دولت مند کو مکان، گھوڑے اور ہاتھی وغیرہ سب کچھ خدا تعالیٰ ہی دیتا ہے مگر ایسے لوگوں کے پاس چونکہ یہ سب کچھ ماں باپ کی طرف سے پہنچتا ہے اِس لئے یہ بات کہ خدا دیتا ہے ان کی نظر میں نہیں آ سکتی۔وہ کہتے ہیں کہ یہ چیزیں تو ہمیں ماں باپ سے بطور ورثہ ملی ہیں ایسے لوگوں کی زندگی خدا تعالیٰ کے فضل کو ظاہر کرنے والی نہیں ہوتی ان کی نظر صرف مادیات میں پھرتی ہے خدا تعالیٰ کی طرف نہیں جاتی۔

غرض اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ سے اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ محمد صلی اللہ علیہ

وسلم کی ساری زندگی خطرات سے پُر ہوگی لیکن ہر خطرہ کے وقت میں اس کی مدد کروں گا۔ پس یہ ایک پیشگوئی نہیں بلکہ دو پیشگوئیاں ہیں ایک طرف تو آپ کے متواتر خطرات سے دوچار ہونے کی پیشگوئی ہے اور دوسری طرف متواتر ان خطرات کو دور کرنے اور آپ کی مدد کرنے کی پیشگوئی ہے۔ سب سے پہلا خطرہ جو آپ کو اپنی زندگی میں پیش آیا وہ یہ تھا کہ ابھی آپ اپنی والدہ کے پیٹ میں ہی تھے کہ آپ کے والد کی وفات ہوگئی۔ اُس وقت قدرتاً یہ خیال پیدا ہوسکتا تھا کہ اس بچہ کو جو ابھی ماں کے پیٹ میں ہے پالے گا کون؟ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اِدھر آپ پیدا ہوئے اور اُدھر آپ دادا عبدالمطلب کی گود میں پہنچ گئے۔ انہوں نے بچے کو دیکھتے ہی کہا یہ تو چاند سا مُکھڑا ہے اور پھر فرطِ محبت سے بچے کو گود میں اُٹھا کر بیت اللہ میں لے گئے اور وہاں جا کر خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا گویا باپ کی موت کے بعد یکدم خدا تعالیٰ نے باپ کی جگہ آپ کے دادا کے دل میں باپ جیسی شفقت بھر دی اور اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ کی پیشگوئی پہلی بار پوری ہوئی۔ یہ صرف خدا تعالیٰ کا فضل اور اُس کی مدد ہی تھی ورنہ ہم روزانہ کئی واقعات دیکھتے ہیں کہ جب کسی شخص کا کوئی ایسا لڑکا فوت ہو جائے جس کی اولاد ہو تو وہ اپنے پوتے کی طرف سے توجہ پھیر لیتا ہے اور اُسے پرواہ ہی نہیں ہوتی کہ وہ اس کا پوتا ہے اسی طرح اس کے دوسرے لواحقین بھی اپنی توجہ اس کی طرف سے پھیر لیتے ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اس بچہ کے ساتھ دُور کا بھی رشتہ نہیں۔ لیکن آپ کے والد کی وفات کے بعد خدا تعالیٰ نے آپ کے دادا کے دل میں آپ کے لئے بے انتہا محبت بھر دی اور اس نے کہا یہ تو ہمارا بیٹا ہے اور چاند کا ٹکڑا ہے یہ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ والی پیشگوئی کا ہی ظہور تھا کہ باپ نہ تھا تو دادا کے دل میں اللہ تعالیٰ نے محبت اور اُلفت پیدا کر دی۔ پس اللہ تعالیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ اے محمد ﷺ! اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ جب تمہارا باپ نہ تھا تو کیا ہم تمہارے باپ بنے تھے یا نہ؟

پھر اس کے بعد خدا تعالیٰ نے جو کام آپ سے لینے تھے وہ تقاضا کرتے تھے کہ آپ کی صحت اعلیٰ درجہ کی ہو اور آپ کے قویٰ نہایت مضبوط ہوں کیونکہ آپ نے ایک طرف تمام انبیاء سے افضل نبی بننا تھا اور دوسری طرف اعلیٰ درجہ کا جرنیل بھی بننا تھا مگر مکہ میں پھلوں کی بھی کمی تھی،

پانی کی بھی کمی تھی اور سبزیوں وغیرہ کی بھی کمی تھی اور جب تک مکہ کے لوگ بیرونجات میں جا کر نہ رہیں ان کی صحت اچھی نہیں رہ سکتی۔ بیرونجات سے مکہ میں پھل اور سبزیاں وغیرہ تو پہنچ جاتی تھیں لیکن اگر باہر سے چیزیں چلی بھی جاتیں تو بھی تازہ بتازہ پھلوں اور سبزیوں کا مل جانا جو اثر رکھتا ہے وہ باہر سے آئی ہوئی چیزوں میں کہاں ہوتا ہے۔ مکہ کے لوگوں میں یہ دستور تھا کہ وہ اپنے بچوں کو باہر کے گاؤں میں ۵ یا ۶ ماہ کی عمر میں بھجوا دیتے تھے اور جب وہ ۸۔۹ سال کی عمر کے ہوتے تھے تو انہیں واپس لے آتے تھے اور بعض لوگ تو سال دو سال کے بعد ہی واپس لے آتے تھے اور بعض ۸۔۹ سال کا ہو چکنے پر لے آتے۔ اِس سے یہ فائدہ ہوتا کہ ان کی صحت بھی اچھی ہو جاتی اور ان بچوں کی زبان بھی شہر والوں کی نسبت زیادہ صاف ہو جاتی کیونکہ بدویوں کی زبان شہر والوں کی نسبت زیادہ صاف تھی اور شہریوں کی زبان باہر سے قبائل آتے رہنے کی وجہ سے مخلوط سی ہو جاتی تھی۔ غرض مکہ میں ہر چھٹے مہینے باہر کے گاؤں کی عورتیں آتیں اور دودھ پیتے بچوں کو پالنے کے لئے ساتھ لے جاتیں وہ شہر میں چکر لگاتی تھیں اور جس کسی نے اپنا بچہ ان کے حوالہ کرنا ہوتا کر دیتا تھا۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد آس پاس کے دیہات کی عورتیں شہر میں آئیں حضرت عبدالمطلب کا گھر بہت مشہور تھا اور ایک قبیلہ کا سردار ہونے کی وجہ سے ان کی بہت زیادہ شہرت تھی اس لئے دیہات سے آنے والی ان دایہ عورتوں میں سے ہر ایک کی خواہش تھی کہ عبدالمطلب کے پوتے کو وہ اپنے ساتھ لے جائے مگر جب انہوں نے سنا کہ بچہ کا والد فوت ہو چکا ہے تو انہوں نے خیال کیا کہ اس یتیم بچہ کو پالنے کے بدلہ میں ہمیں کون انعام دے گا۔ چنانچہ یکے بعد دیگرے کئی عورتیں آپ کی والدہ کے گھر میں آئیں مگر یہ معلوم ہونے پر کہ اِس بچے کا والد فوت ہو چکا ہے واپس چلی گئیں اور کسی نے اس یتیم بچہ کو اپنے ساتھ لے جانا نہ چاہا۔ پانچویں چھٹے نمبر پر حلیمہ آئی مگر اس نے بھی جب بچہ کے یتیم ہونے کے متعلق سنا تو اس بہانہ سے کہ میں پھر آتی ہوں چلی گئی مگر جس طرح اس بچہ کا گھر غریب تھا اسی طرح حلیمہ بھی غریب تھی وہ سارا دن مکہ کے شہر میں بچوں والوں کے گھروں میں پھری لیکن کسی نے اُس کو منہ نہ لگایا گویا ایک طرف ان ساری دایہ عورتوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ردّ کر دیا اور دوسری طرف سارے بچوں والوں نے حلیمہ کو ردّ کر دیا اور جس طرح یسعیا نے

کہا تھا ویسا ہی ہوا کہ ’’ وہ پتھر جسے معماروں نے ردّ کیا کونے کا سرا ہو گیا‘‘[۳۳] آخر حلیمہ کو خیال آیا کہ میں صبح اس بچے کو اس لئے چھوڑ آئی تھی کہ وہ یتیم ہے اور پھر سارے شہر میں سے کسی نے اپنا بچہ مجھے نہ دیا اگر میں اب پھر اسی یتیم بچہ کے گھر جاؤں گی تو اس گھر والے کہیں گے تم ہمارے بچے کو چھوڑ کر گئی تھیں تمہیں بھی سارے شہر سے کوئی بچہ نہ ملا اس لئے وہ کچھ شرمائی ہوئی آمنہ کے گھر آئی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ لے گئی مگر اس طرح کہ اِدھر آپ کو حلیمہ کے ساتھ بھیجتے وقت آپ کی والدہ کو بھی خیال آیا کہ حلیمہ غریب عورت ہے اور اس کے پاس کھانے کو کچھ نہیں ہے اُدھر حلیمہ اپنے دل میں کہہ رہی تھی کہ بچہ تو میں لے ہی چلی ہوں مگر مجھے اس کے پالنے کا انعام کہاں مل سکتا ہے لیکن حلیمہ بیان کرتی ہیں کہ جب میں اِس بچے کو لے کر گھر پہنچی تو خدا کی قسم! ہماری وہ بکریاں جن کا دودھ سُوکھ چکا تھا اِس بچے کی برکت سے ان بکریوں کے سُوکھے ہوئے تھنوں میں دودھ بھر گیا اور خدا تعالیٰ نے میرے گھر میں برکت بھر دی۔[۳۴] برکت کا مطلب یہ تو نہیں کہ آسمان سے کوئی چیز گرتی ہے ہاں خدا تعالیٰ نے ان بکریوں کے معدے تیز کر دیئے اور وہ گھاس اچھا کھا لیتی تھیں اور دودھ زیادہ دینے لگ گئیں۔

پس اللہ تعالیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرماتا ہے اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ کہ جب تمہیں پالنے کا زمانہ آیا تو ایک طرف دیہات کی دایہ عورتوں نے تمہیں رد کر دیا دوسری طرف تمہاری ماں نے دکھتے ہوئے دل کے ساتھ تمہیں ایک غریب دایہ کے سپرد کیا مگر دیکھو ہم نے تمہارے لئے انتظام کیا یا نہ کیا؟ دو سال کے بعد جب رضاعت کی مدّت پوری ہوئی تو دستور کے مطابق حلیمہ آپ کو لے کر مکہ میں آئی اور آمنہ سے جو کچھ ہوسکتا تھا انہوں نے حلیمہ کو دے دیا مگر حلیمہ کے دل میں آپ کے لئے اتنی محبت پیدا ہو چکی تھی کہ اس نے بہ اصرار آپ کی والدہ سے کہا کہ اس بچہ کو کچھ عرصہ اور میرے پاس رہنے دو چنانچہ وہ پھر آپ کو ساتھ لے کر خوش خوش واپس گھر چلی گئی۔ جب آپ کی عمر چار سال کی ہوئی تو حلیمہ آپ کو لے کر مکہ میں آئی اور آپ کی والدہ کے سپرد کر گئی والدہ سے جو کچھ ہوسکتا تھا انہوں نے حلیمہ کو دیا اور جو کچھ اسے ملا وہ لے کر چلی گئی۔ یوں تو حضرت عبدالمطلب بڑے قبیلہ کے آدمی تھے اور ان کا شمار بہت بڑے سرداروں میں ہوتا تھا مگر وہ اتنے زیادہ امیر

نہ تھے صرف کھاتے پیتے لوگوں سے تھے ان کی اولاد بہت زیادہ تھی اس لئے اخراجات بھی زیادہ تھے اس لئے وہ حلیمہ کو کچھ زیادہ نہ دے سکے مگر وہی حلیمہ جس کو وہ چھوٹا بچہ لے جاتے وقت یہ خیال تھا کہ اس کو پالنے کے بدلہ میں مجھے کیا ملنا ہے یہ بچہ تو یتیم ہے جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کیا اور اس کے بعد جنگ حنین میں حلیمہ کی ساری قوم قید ہو کر آ گئی تو آپ نے یہ خیال کیا کہ یہ لوگ جب سفارش لے کر میرے پاس آئیں گے تو ان سب قیدیوں کو میں چھوڑ دوں گا مگر وہ لوگ (جو قبیلہ ہوازن کے تھے) اِس شرم سے آپ کے پاس سفارش کے لئے نہ آئے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو ہمارا بچہ تھا اور ہم نے اس کے ساتھ جنگ کی ہے ہم کس طرح اس کے پاس جا کر سفارش کریں۔ آخر آپ کی رضائی بہن یعنی حلیمہ کی بیٹی آپ کے پاس آئی اور آپ نے اس کی ساری قوم کو آزاد کر دیا۔[۵]

اب دیکھو یہ اتنا بڑا بدلہ تھا کہ سارے عرب میں سے کسی بڑے سے بڑے سردار کی طرف سے بھی کسی بچہ کو پالنے کا نہ ملا ہوگا۔ آپ نے اپنی رضائی بہن کی سفارش پر ان کی قوم کے تین ہزار قیدی بِلا فدیہ رہا کر دیئے۔ اگر ایک قیدی کا فدیہ پانچ سَو بھی شمار کیا جائے تو یہ رقم پندرہ لاکھ بنتی ہے مگر آپ نے صرف حلیمہ کی خدمت کے بدلہ میں ان سب قیدیوں کو رہا کر دیا۔ اب دیکھو یہ کتنا بڑا انعام تھا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حلیمہ کو ملا۔

پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ اے محمد ﷺ! تجھے گاؤں کی ساری عورتیں رد کر گئی تھیں اور حلیمہ بھی تجھے ایک دفعہ ردّ کر کے چلی گئی تھی اس خیال سے کہ تم غریب تھے مگر کیا میں نے تیری غربت کو دور کیا یا نہ کیا؟ اور تجھ سے حلیمہ کو وہ انعام دلوایا جو سارے عرب میں سے کبھی کسی نے نہ دیا تھا اور نہ دے سکتا تھا۔

اس کے بعد آپ کو یہ صدمہ پہنچا کہ آپ کے دادا حضرت عبدالمطلب فوت ہو گئے۔ یہ حادثہ بھی آپ کے لئے نہایت تکلیف دِہ تھا مگر حضرت عبدالمطلب نے اپنی وفات کے وقت اپنے بیٹے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب کو بُلایا اور اُن کو وصیت کی کہ دیکھو! محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو میری امانت سمجھنا اور ہر چیز سے اِس کو زیادہ عزیز رکھنا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کہنے کو تو سب لوگ کہہ جاتے ہیں مگر خیال رکھنے والے بہت کم لوگ ہوتے ہیں۔ بیویاں

مرنے لگتی ہیں تو اپنے خاوندوں سے کہہ جاتی ہیں میرے بچوں کا خاص خیال رکھنا۔ مگر خاوند جب دوسری شادیاں کرتے ہیں تو پہلی بیوی کی اولاد کو کوئی پوچھتا تک نہیں اور وہ اولاد دھکے کھاتی پھرتی ہے۔ خاوند مرتے ہیں تو وہ بھی اپنی اولاد کے متعلق کسی کو خاص خیال رکھنے کے لئے کہہ جاتے ہیں مگر ہم نے دیکھا ہے کہ ان کے بچے بھی در بدر کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں اور بعض نظارے تو نہایت دردناک دکھائی دیتے ہیں۔ پس ہوسکتا تھا کہ ابوطالب بھی اپنے باپ کی وفات کے وقت کی وصیت کا کوئی خیال نہ رکھتے مگر وہ کس طرح نہ رکھتے جبکہ خدا تعالیٰ عرش سے اُن کو وصیت کر رہا تھا اور اُن کے دل میں محمد ﷺ کے لئے بے انتہا محبت پیدا کر رہا تھا۔ پس جب آپ ابوطالب کی کفالت میں آئے تو باوجود یکہ ابوطالب کی بہت سی اولاد تھی اور وہ تھے بھی غریب آدمی مگر وہ آپ کے ساتھ اپنے بچوں سے بڑھ کر محبت کرتے تھے اور وہ آپ کو اتنا عزیز رکھتے تھے کہ ہر وقت آپ کو اپنی آنکھوں کے سامنے رکھتے تھے یہاں تک کہ رات کو بھی اپنے پاس ہی سُلاتے تھے۔ ابوطالب کی بیوی یعنی آپ کی چچی کے دل میں وہ محبت آپ کے لئے نہ تھی وہ بعض دفعہ کوئی چیز اپنے بچوں میں تقسیم کر دیتی تھی اور آپ کو نہ دیتی تھی مگر آپ کے وقار کا بچپن میں ہی یہ عالم تھا کہ باوجود آٹھ نو سال کی عمر کے آپ نے کبھی ایسی باتوں کا شکوہ نہ کیا اور کبھی اپنے منہ سے کوئی چیز نہ مانگی۔ ابوطالب جب آپ کو ایک طرف بیٹھے دیکھتے تو سمجھ جاتے کہ کوئی بات ہے وہ دیکھتے کہ ان کی بیوی اپنے بچوں میں کوئی چیز تقسیم کر رہی ہے تو وہ پیار سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گود میں اُٹھا لیتے اور یہ نہیں کہتے کہ یہ میرا بھتیجا ہے بلکہ بیوی سے کہتے تُو نے میرے بیٹے کو تو دیا ہی نہیں یعنی وہ اپنے بیٹوں کو بیٹے نہیں سمجھتے تھے بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی حقیقی بیٹا سمجھتے تھے اور وہ بار بار دُہراتے جاتے تھے کہ تُو نے میرے بیٹے کو تو دیا ہی نہیں۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جب ماں باپ کی اپنی اولاد زیادہ ہوتی ہے تو دوسروں کی اولاد اُن کی نظر میں ہی نہیں جچتی مگر خدا تعالیٰ نے ابوطالب کے دل میں آپ کے لئے اتنی محبت پیدا کر دی تھی کہ وہ محمد رسول اللہ ﷺ کے مقابلہ میں اپنے بیٹوں کو بیٹے ہی نہیں سمجھتے تھے۔ یہ بھی اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ کا ہی نمونہ تھا۔ پس اللہ تعالیٰ رسول کریم ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ کہ

اے محمد رسول اللہ ﷺ! تُو یتیم تھا مگر میں نے تیری کفالت کی یا نہ کی اور تیرے یُتم کو دُور کیا یا نہ کیا؟

پھر آپ بڑے ہوئے اُس وقت یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ آپ کونسا کاروبار کریں۔ آپ کے پاس کوئی جائداد نہ تھی جس سے کوئی کاروبار شروع کرتے، نہ ہی آپ جس چچا کی کفالت میں تھے ان کے پاس کوئی مال و دولت تھا کہ وہ آپ کو کاروبار کے لئے کچھ رقم دے دیتے۔ ان کی تو یہ حالت تھی کہ باہر سے آنے والے لوگ کچھ خدمت کر جاتے تھے اور ان کا گذارہ ہو جاتا تھا اس لئے وہ آپ کی کچھ مدد نہ کر سکتے تھے۔ غرض باوجود اس کے کہ آپ کے پاس کاروبار کے لئے کوئی سامان نہ تھا اور آپ کو کوئی فن بھی نہ آتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی مدد فرمائی اور وہ اس طرح کہ ایک قافلہ تجارت کے لئے شام کی طرف جا رہا تھا ایک دولت مند عورت نے آپ کو دیانتدار سمجھتے ہوئے (کیونکہ آپ امین کے نام سے مشہور تھے) آپ کو بُلایا اور کہا میں آپ کے سپرد اپنے اموال کرتی ہوں آپ قافلہ کے ساتھ شام کو جائیں اور تجارت کر کے واپس آئیں میں آپ کو اِس اِس قدر حصہ دوں گی۔ لوگ تو دَوڑتے پھرتے ہیں اور کبھی کسی کے پاس جاتے ہیں اور کبھی کسی کے دروازہ پر پہنچتے ہیں کہ نوکری مل جائے لیکن اِس دولت مند عورت نے خود بُلا کر آپ کو نوکری دی۔ اب دیکھو جب آپ کی کمائی کا زمانہ آیا تو کُجا یہ حالت کہ لوگ نوکریوں کے لئے مارے مارے پھرتے ہیں اور کُجا یہ حالت کہ وہ دولت مند عورت آپ کو بُلا کر خود اپنی بہت سی دولت آپ کے سپرد کرتی ہے اور کہتی ہے آپ قافلہ کے ساتھ تجارت کے لئے جائیں چنانچہ آپ قافلہ کے ساتھ شام کو گئے اور آپ نے ایسی دیانت داری اور محنت سے کام کیا اور اتنا نفع ہوا کہ پہلے اس عورت کو تجارت میں کبھی اتنا نفع نہ ہوا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ پہلے وہ اپنے نوکروں کے سپرد سارا کاروبار کرتی تھی اور وہ لوگ دیانت داری سے کام نہ کرتے تھے مگر آپ نے ایسا انتظام کیا کہ کسی کو نفع کی رقم سے چھونے تک نہ دیا۔ غرض آپ بہت زیادہ نفع کے ساتھ تجارت کر کے واپس آئے۔ اُس وقت آپ کی عمر شادی کے قابل تھی مگر آپ غریب آدمی تھے اور غریبوں کو لڑکیاں کون دیتا ہے، غریبوں کو تو غریب گھرانوں سے بھی لڑکیاں نہیں ملتیں مگر جب آپ تجارت کر کے واپس مکہ پہنچے اور آپ نے تجارت کا سارا نفع اُس عورت کے

سامنے پیش کیا تو وہ اتنا نفع دیکھ کر حیران رہ گئی اور اُس نے نوکروں سے پوچھا اتنی دولت کس طرح نفع میں آ گئی؟ اُنہوں نے کہا بات یہ ہے کہ آپ جب ہمیں تجارت کے لئے بھیجتی تھیں تو ہم اس میں سے خود بھی کھاتے پیتے تھے مگر محمد (ﷺ) نے تو کسی کو ہاتھ بھی لگانے نہیں دیا نفع نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ غرض آپ نے تجارت کا کام اس خوش اسلوبی سے کیا کہ وہ دولت مند عورت آپ کی ایمانداری کی قائل ہوگئی۔ وہ بیوہ عورت تھی اور بہت بڑے مال کی مالک تھی، اُس کے بہت سے غلام تھے اور نوکر چاکر تھے اِسی لئے اُس کے قافلے دوسرے مُلکوں میں جا کر تجارت کرتے تھے ورنہ دوسرے ملکوں میں قافلہ بھیجنا معمولی بات نہیں وہ اپنی ایک سہیلی کے ساتھ بات چیت کر رہی تھی کہ سہیلی نے اسے کہا بی بی! تم ابھی جوان ہو اور بیوہ ہو چکی ہو اور پھر تمہیں ایسا اچھا دیانت دار اور ایماندار خاوند مل سکتا ہے جس کی دیانتداری اور ایمانداری کی مثال سارے شہر میں نہیں مل سکتی اس لئے تمہیں چاہئے کہ اس کے ساتھ شادی کرلو۔ اس دولت مند عورت نے اپنی سہیلی کو جواب دیا کہ ہے تو تمہاری بات ٹھیک لیکن اگر یہ بات میرے باپ نے سن لی تو وہ مجھے جان سے مار ڈالے گا۔ سہیلی نے کہا تم اس بات کی فکر نہ کرو یہ سب انتظام میں خود کرلوں گی۔ چنانچہ اُس نے اِدھر اس کے باپ کو راضی کر لیا اور اُدھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور کہا اگر آپ کی شادی ایک دولت مند عورت سے ہو جائے تو کیا آپ پسند کریں گے؟ آپ نے فرمایا میرے پاس تو کچھ ہے نہیں اس لئے کوئی دولت مند عورت میرے ساتھ کس طرح شادی کرنے پر رضامند ہو سکتی ہے۔ اُس نے کہا آپ کے پاس جو چیز ہے اُس کو ہر عورت ہی پسند کرتی ہے اور وہ ہے آپ کی دیانت امانت اور شرافت اس لئے آپ اس بات کا فکر نہ کریں کہ آپ کے پاس مال و دولت نہیں ہے آپ کے پاس جو چیز ہے اس کے مقابلہ میں مال و دولت کیا چیز ہے۔ آپ نے فرمایا اپنے چچا کی اجازت کے بغیر شادی نہیں کر سکتا۔ اُس نے کہا اچھا میں آپ کے چچا سے بھی پوچھ لیتی ہوں چنانچہ وہ ابوطالب کے پاس گئی انہوں نے رضامندی کا اظہار کیا اور آپ کی شادی ہوگئی۔[۶] پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ کہ اے محمد ﷺ! تیرے پاس کاروبار کے لئے کچھ نہ تھا مگر ہم نے انتظام کیا یا نہ کیا؟ اور جب تیری شادی کا موقع آیا تو باوجود اس کے کہ تُو غریب تھا

بتا ہم نے تیری شادی کا انتظام کیا یا نہ کیا؟

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ اگر مرد غریب ہو اور عورت امیر ہو تو مرد کو بسا اوقات ذلّت اُٹھانی پڑتی ہے۔ ہمارے ایک نانا تھے جن کے گھر نواب لوہارو کی بیٹی تھیں اور وہاں سے ہی اُن کو اخراجات کے لئے کچھ رقم آ جاتی تھی۔ ہمارے نانا کام تو کرتے تھے اور بیس پچیس روپیہ ماہوار آمدن بھی ہو جاتی تھی مگر اُن کا دستور تھا کہ سارا دن کام کرتے اور جو رقم آتی اس میں سے صرف ایک روپیہ ماہوار اپنے اوپر خرچ کرتے تھے، اُسی میں سے کپڑے کی دھلائی اور باقی ضرورتیں پوری کرلیا کرتے تھے، کھانے کے لئے اُن کو ایک چپاتی کافی تھی باقی رقم وہ ساری جمع رکھتے تھے اُن کو اِس بات کا بہت زیادہ احساس تھا گھر میں جو کچھ خرچ ہونا ہے یہ بیوی کا مال ہے مجھے اپنی ضروریات پر یہ روپیہ صَرف نہیں کرنا چاہئے۔ اُن کو چائے پینے کا بہت شوق تھا مگر چائے میں چھوٹا سا ایک بتاشہ ڈال کر پی جاتی تھے گویا انہوں نے اپنے نفس کو مارا ہوا تھا صرف اِس لئے کہ گھر میں جو کچھ خرچ ہوتا تھا وہ بیوی کا مال تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد اُن کی بیوی کے والد یعنی اُن کے سسر فوت ہو گئے اور بھائیوں نے روپیہ بھجوانا بند کر دیا اِس پر انہوں نے اپنی بیوی سے کہا کہ تمہارے والد نے جو رقم مجھے اتنا عرصہ بھیجی تھی اب میں تم کو با قاعدہ دوں گا۔ چنانچہ انہوں نے وہ جمع شدہ رقم ساری کی ساری بیوی کو دے دی۔ اب دیکھو یہ بات طبیعت پر کتنی گراں گزرتی ہے کہ خاوند غریب ہو اور بیوی امیر ہو اور خاوند بیوی کا مال کھاتا رہے۔ مگر جہاں خدا تعالیٰ نے یہ انتظام کیا کہ آپ کی شادی حضرت خدیجہؓ جیسی امیر عورت سے ہو گئی وہاں ایک ابتلاء آپ کے لئے یہ بھی تھا کہ حضرت خدیجہؓ بہت زیادہ امیر تھیں اور آپ غریب تھے مگر اللہ تعالیٰ نے اس ابتلاء کو اِس طرح دُور کیا کہ کچھ عرصہ کے بعد حضرت خدیجہؓ کے دل میں یہ احساس پیدا ہوا کہ اتنا خوددار اور نیک خاوند میرے مال کو برداشت نہ کر سکے گا اس لئے اس نے اپنے دل میں فیصلہ کیا کہ اپنا سارا مال آپ کے حوالے کر دے یہ سوچ کر حضرت خدیجہؓ نے ایک دن آپ سے کہا میں ایک عرض کرنا چاہتی ہوں۔ آپ نے فرمایا خدیجہ! کیا بات ہے؟ حضرت خدیجہؓ نے کہا میں چاہتی ہوں کہ اپنا سارا مال و متاع اور غلام آپ کے سپرد کر دوں۔ آپ نے فرمایا خدیجہ! کیا تم نے اس بات کو اچھی طرح سوچ سمجھ لیا

ہے ایسا نہ ہو کہ بعد میں پچھتاؤ۔ حضرت خدیجہؓ نے کہا میں نے اچھی طرح اِس معاملہ پر غور کر لیا ہے چاہے کچھ ہو جائے میں اپنا سارا مال آپ کے سپرد کرتی ہوں۔ آپ نے فرمایا اگر یہ بات ہے تو پہلا کام میں یہ کرتا ہوں کہ اِن سارے غلاموں کو آزاد کرتا ہوں۔ حضرت خدیجہؓ نے خندہ پیشانی سے اِس بات کو برداشت کر لیا مگر چونکہ آپ کو تجارت وغیرہ کے معاملہ میں ایک ساتھی کی بھی ضرورت تھی اِس لئے آپ نے جن غلاموں کو آزاد کیا اُن میں سے ایک غلام زید نے تو کہا آپ نے مجھے آزاد کر دیا ہے مگر آپ کے اخلاق اِس قسم کے ہیں کہ میں آپ سے جُدا نہیں ہونا چاہتا۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ اے محمد! (ﷺ) تم اِس بات کو برداشت نہ کر سکتے تھے کہ تم اپنی بیوی کے مال پر گذارہ کرو اس لئے ہم نے تمہارے لئے یہ انتظام کر دیا کہ تمہاری بیوی نے اپنا سارا مال تمہارے قدموں میں لا کر پھینک دیا۔ پھر آپ کو غلام آزاد کرنے کے بعد ایک ساتھی کی ضرورت تھی اس کے لئے ہم نے یہ انتظام کیا کہ تم نے جن غلاموں کو آزاد کیا تھا ان میں سے ایک نے کہہ دیا کہ آپ بے شک مجھے آزاد کر دیں مگر چونکہ آپ کے اخلاق نہایت اعلیٰ درجہ کے ہیں اس لئے میں آپ سے جُدا ہونا نہیں چاہتا۔ اس طرح ہم نے تمہارے ساتھی کی ضرورت بھی پوری کر دی۔ غرض ہم دیکھتے ہیں کہ کس طرح قدم بقدم ہر ضرورت کے وقت، ہر مصیبت کے وقت، ہر خطرہ کے وقت اور ہر تکلیف کے وقت اللہ تعالیٰ نے اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ کا نمونہ آپ کی ذات سے اعلیٰ اور ارفع طور پر وابستہ کر کے دکھا دیا فَسُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ وَسُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْم۔

فرمودہ ۲۵ جون ۱۹۴۷ء

آج مَیں پھر اسی مضمون کو لیتا ہوں جو کچھ دن ہوئے میں نے شروع کیا تھا وہ مضمون تو ایسا ہے جس کے بیان کرنے کے لئے صحت کاملہ کا ہونا ضروری ہے کیونکہ مضمون بہت زیادہ تشریح چاہتا ہے اور مجھے چار پانچ دن سے کان میں تکلیف رہی ہے اب کچھ افاقہ ہے اس لئے میں نے ارادہ کیا ہے کہ آج اس مضمون کا کچھ حصہ بیان کر دوں۔ وہ مضمون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری زندگی میں اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ کے نظاروں کے متعلق

ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر نازک موقع پر، ہر دکھ اور ہر پریشانی کے وقت آپ کے ساتھ اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ کا ثبوت دیا۔ ویسے تو یہ ایک ہی آیت ہے مگر یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ہزاروں واقعات اور ہزاروں ایمان افروز نظاروں کا مجموعہ ہے۔ آپ کے سوانح کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قدم قدم پر ہر مصیبت کے وقت آپ کے ساتھ اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ کا معاملہ کیا۔

قبل ازیں میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی شادی تک کے واقعات بیان کئے تھے آج میں اس سے آگے یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ جب آپ کی شادی ہو چکی اور کچھ عرصہ کے بعد آپ کی عمر ایسی حالت کو پہنچ گئی جو روحانی بلوغت کی عمر کہلاتی ہے تو اُس وقت بھی اللہ تعالیٰ نے ہی آسمان سے آپ کی مدد کی اور آپ کی روحانی پیاس کو بجھانے کا سامان پیدا کیا۔

یہ امر یاد رکھنا چاہئے کہ بلوغت دو قسم کی ہوتی ہے ایک بلوغت جسمانی ہوتی ہے جو اٹھارہ سے اکیس سال کی عمر تک ہوتی ہے اور ایک بلوغت عقلی ہوتی ہے جو اٹھارہ سے پچیس سال کی عمر تک ہوتی ہے لیکن ان دونوں قسموں کے علاوہ بلوغت کی ایک قسم روحانی بھی ہے جس میں انسان کے تقاضائے طبعی بالغ ہو جاتے ہیں اور انسان اپنے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے لئے ایک خاص لائحہ عمل تجویز کرتا ہے۔ روحانی بلوغت کی عمر کے متعلق قرآن کریم سے اور بزرگوں کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ چالیس سال کی عمر ہے۔

۱۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرماتا ہے وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّہٗ[۷] یعنی جب اپنی بلوغت روحانیہ کو پہنچ گئے۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ مکمل جوانی یا بلوغت روحانیہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتا ہے حَتّٰۤی اِذَا بَلَغَ اَشُدَّہٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً[۸] یعنی جب انسان کامل جوانی کو پہنچ گیا اور اُس کی عمر چالیس سال کی ہو گئی۔

پس بلوغت روحانی چالیس سال کی عمر سے شروع ہوتی ہے وہاں بعض اوقات اللہ تعالیٰ نے اپنی کسی حکمت اور مصلحت کے ماتحت ایسے انبیاء کو بھی مبعوث فرمایا ہے جن کی عمر چالیس سال سے کم تھی۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے جب حضرت یحییٰ کو مبعوث فرمایا اُس وقت ان کی عمر چھبیس سال تھی اسی طرح حضرت عیسیٰ کی عمر بعثت کے وقت تیس سال تھی لیکن ان دونوں انبیاء کی بعثت

چالیس سال سے کم عمر میں ضرورت اور حکمت کے ماتحت ہوئی۔ حضرت یحییٰ کے متعلق خدا تعالیٰ کا منشاء یہ تھا کہ ان کو جلدی ہی اُٹھا لیا جائے ان کی بعثت چھبیس سال کی عمر میں ہوئی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے چونکہ بنی اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کی تلاش میں نکلنا تھا جو ان سے پہلے کسی زمانہ میں ملک بدر کر دی گئی تھیں اور خدا تعالیٰ نے ان کو افغانستان اور کشمیر وغیرہ کے علاقوں میں پھیلا دیا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو چالیس سال سے کم عمر میں ہی مبعوث فرمایا تا کہ آپ پہلے اپنی قوم کے ایک حصہ کو ہدایت دے لیں اور بلوغت حقیقی سے پہلے پہلے بنی اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کی تلاش کر لیں۔ اُس زمانہ میں چونکہ سفر کرنا مشکل تھا نہ ریل تھی، نہ تاریں تھیں اور نہ ڈاکخانے تھے اس لئے بنی اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کی تلاش ایک لمبے وقت کی متقاضی تھی۔ اُس زمانہ میں تیز رَو سواریاں نہ ہونے کی وجہ سے ایک مُلک سے دوسرے مُلک تک پہنچنے میں بعض اوقات سال بلکہ دو دو سال لگ جاتے تھے کیونکہ سمندر کے رستے سے جانا بھی مشکل تھا اور پہاڑوں کو عبور کرنا بھی مشکل تھا اُس وقت راستے نہایت دشوار گزار ہوتے تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تیس سال کی عمر میں ہی مبعوث فرما دیا تا کہ آپ پہلے اپنی قوم کی راہنمائی فرما لیں اور جب آپ بلوغت حقیقی کو پہنچیں تو بنی اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کو تلاش کر چکے ہوں۔ مگر عام طور پر اللہ تعالیٰ کا قانون یہی ہے کہ وہ چالیس سال کی عمر میں ہی انبیاء کو مبعوث فرماتا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم چالیس سال کی عمر میں ہی مبعوث ہوئے تھے۔ بہرحال جب آپ اس عمر کے قریب پہنچے تو گردو پیش کے ماحول نے جو کفر و اِلحاد سے بھرا پڑا تھا آپ کے دل پر گہرا اثر ڈالا اور آپ کی طبیعت اس سے سخت متنفر اور بیزار ہوئی۔ آپ نے جیسا کہ ہر نبی ہی شرک سے پاک ہوتا ہے کبھی شرک نہیں کیا تھا بلکہ مشرکانہ خیالات بھی آپ کے قریب تک نہ پھٹکے تھے مگر وہ توحید کامل جو شریعت الٰہیہ کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی آپ ابھی اُس سے ناواقف تھے اس لئے طبعی طور پر آپ کے دل میں توحید کامل کی جستجو پیدا ہوئی اور معرفت حقّہ اور عرفانِ تامّ کی تڑپ آپ کو ستانے لگی۔ گردو پیش کے حالات نے آپ کو اور بھی ابھارا اور آپ ہمہ تن یادِ خدا میں مصروف رہنے کیلئے خویش و اقارب کو ترک کر کے شہر سے باہر ایک غار میں جسے غار حرا کہتے ہیں تشریف لے جاتے اور کئی

کئی دن وہاں عبادتِ الٰہی میں مصروف رہتے۔ جب آپ کا زاد ختم ہو جاتا تو آپ واپس مکہ میں تشریف لاتے اور پھر کچھ ستّو اور کھجوریں یا سوکھا گوشت وغیرہ ساتھ لے کر عبادتِ الٰہی کے لئے غارِ حرا میں چلے جاتے۔ آپ کو اس ریاضت شاقہ سے صرف ایک ہی غرض تھی اور وہ یہ کہ آپ کو وہ حقیقی راستہ مل جائے جو انسان کو خدا تعالیٰ تک پہنچانے والا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اُس وقت آپ کی ایک جاں نثار بیوی موجود تھی مگر وہ اس معاملہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی، آپ کے گہرے اور وفادار دوست موجود تھے مگر وہ بھی اس معاملہ میں آپ کی کوئی مدد کرنے سے قاصر تھے، آپ کے زمانہ میں بعض مذاہب بھی موجود تھے مگر ان کے پیرو بھی روحانی سر چشمہ سے دور ہو جانے کی وجہ سے قسم قسم کے مشرکانہ خیالات میں ملوث ہو چکے تھے۔ کفار مکہ نے تو خانہ کعبہ میں بھی ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے اور یہودی حضرت عزیر کو ابن اللہ قرار دے کر مشرک بن رہے تھے اور عیسائی باپ بیٹا اور روح القدس کی خدائی کے دعویدار تھے غرض جب آپ نے دیکھا کہ اہل مذاہب بھی بگڑ چکے ہیں اور دوست وغیرہ بھی اس بارے میں میری کوئی مدد نہیں کر سکتے تو آپ کو اپنے غیر روحانی ماحول سے اتنا انقباض پیدا ہوا کہ آپ نے سمجھا مَیں ان سے کُلّی طور پر علیحدہ نہیں ہو سکتا لیکن میرے لئے ضروری ہے کہ مَیں اِس دنیا سے ایک عارضی انقطاع اختیار کروں اور خدائے واحد سے میں وہ راستہ طلب کروں جو انسان کو خدا تعالیٰ تک پہنچا دینے والا ہو۔ آپ ایسی حالت میں عبادت الٰہی اور دعاؤں میں مصروف تھے کہ ایک دن خدا کا فرشتہ آپ پر نازل ہوا اور اُس نے کہا اِقْرَاْ یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم پڑھ۔ آپ نے فرمایا مَا اَنَا بِقَارِیٍٔ میں تو پڑھ نہیں سکتا۔ اس پر فرشتہ نے زور سے آپ کو اپنے سینہ سے لگا کر بھینچا اور پھر کہا اِقْرَاْ۔ آپ نے پھر وہی جواب دیا جو پہلی مرتبہ دیا تھا۔ تب فرشتہ نے پھر اپنے پورے زور کے ساتھ اپنے سینہ سے لگا کر بھینچا اور کہا اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۔ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ۔ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ [9] یعنی اے محمد! (ﷺ) تُو ربّ کا نام لے کر پڑھ جس نے تمام اشیاء کو پیدا کیا ہے جس نے انسان کو خون کے ایک لوتھڑے سے پیدا کیا ہے ہاں ہم تجھے پھر کہتے ہیں کہ تُو اس کلام کو جو تجھ پر نازل کیا جا رہا ہے لوگوں کو پڑھ کر سنا کیونکہ تیرا ربّ

بڑا کریم ہے۔ تیرا ربّ وہ ہے جس نے انسان کو قلم کے ساتھ سکھایا اور اُس نے انسان کو وہ کچھ بتایا جو وہ پہلے نہیں جانتا تھا۔

یہ وحی آپ پر پہلے دن نازل ہوئی اور اس میں آپ کو یہ عظیم الشان بشارت دی گئی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اب آپ کو ایسے علوم عطا کئے جانے والے ہیں کہ جن کو اس سے پہلے دنیا میں کوئی انسان نہیں جانتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں جس وقت فرشتہ آپ کو یہ آیت سکھا رہا تھا اُس وقت اللہ تعالیٰ عرش پر بیٹھا آپ سے کہہ رہا ہوگا کہ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ اے محمد ﷺ! بتا کہ میں نے تیری ضرورت کو پورا کیا یا نہیں کیا؟ تیری وفادار بیوی موجود تھی، تیرے وفادار دوست موجود تھے، تجھ سے محبت کرنے والے رشتہ دار موجود تھے مگر اُن میں سے کسی کی طاقت نہ تھی کہ وہ اس بارہ میں تیری مدد کر سکے، تیرے زمانہ کے مذہبی علماء جو بڑے بڑے دعوے کر رہے تھے وہ بھی تیری کیا مدد کر سکتے تھے وہ تو گمراہ اور ہدایت سے محروم تھے۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! جب دنیا کا کوئی شخص بھی تیری مدد نہ کرسکتا تھا اُس وقت میں نے تیری ضرورت کو پورا کیا اور پھر میں نے صرف تیری ہی ضرورت کو پورا نہ کیا بلکہ تجھے ساری دنیا کی ضرورتوں کو پورا کرنے والا بنا دیا۔

پھر جب آپ غار حرا سے دنیا کی ہدایت کا پیغام لے کر باہر آئے تو طبعاً آپ کو یہ فکر ہوگا کہ خدا نے ہدایت کا سامان تو پیدا کر دیا مگر ایسا نہ ہو میرے عزیز اِس ہدایت کا انکار کر کے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کے مورد بن جائیں اور اس بارہ میں آپ کو سب سے زیادہ فکر حضرت خدیجہؓ کا ہی ہوسکتا تھا کیونکہ وہ آپ کی بڑی ہی خدمت گزار بیوی تھیں اور آپ کو بھی ان سے بڑی محبت تھی مگر اللہ تعالیٰ کا احسان دیکھو کہ جب آپ اپنے گھر تشریف لائے اور حضرت خدیجہؓ سے اِس واقعہ کا ذکر کیا اور ساتھ ہی اِس خوف کا اظہار کیا کہ نہ معلوم میں اتنی بڑی ذمہ داری کو پوری طرح ادا بھی کرسکوں گا یا نہیں تو حضرت خدیجہؓ جو آپ کی محرم راز تھیں اور جو آپ کی پاکیزہ خلوت اور جلوت کی گواہ تھیں انکار کرنے کی بجائے فوراً بول اُٹھیں کہ كَلَّا وَاللّٰهِ مَا يُخْزِيْكَ اللّٰهُ اَبَدًا اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَتَقْرِى الضَّيْفَ وَتُعِيْنُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ [۱] یعنی خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی ضائع نہیں کرے

گا کیونکہ آپ وہ ہیں جو صلہ رحمی کرتے ہیں، مصیبت زدہ لوگوں کے بوجھ بٹاتے ہیں اور وہ اخلاق فاضلہ جو دنیا سے معدوم ہو چکے ہیں ان کو از سرِنَو قائم کر رہے ہیں اور مہمانوں کی مہمان نوازی کرتے ہیں اگر کوئی شخص محض ظلم کی وجہ سے کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے تو آپ اُس کی اعانت فرماتے ہیں کیا ایسے بلند کردار کا مالک انسان بھی کبھی ضائع ہوسکتا ہے۔ یہ وہ گواہی تھی جو حضرت خدیجہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائی چالیس سالہ زندگی کے متعلق دی اور جس میں آپ نے یہ حقیقت واضح کی کہ آپ کی پہلی زندگی اس طرح گذری ہے کہ آپ نے خدا تعالیٰ کے رستہ میں کبھی کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا اور ہر موقع پر آپ نے خدا تعالیٰ کے ساتھ وفاداری کا ثبوت دیا۔ یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ آپ تو خدا تعالیٰ کے ساتھ وفاداری کریں اور خدا تعالیٰ آپ کے ساتھ وفاداری نہ کرے۔ یہ تو خدا تعالیٰ کی شان سے بعید ہے کہ جو شخص اس کے ساتھ وفاداری کرے وہ اُس کو چھوڑ دے آپ ضرور کامیاب ہوں گے۔ پس آپ کو گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ الفاظ کہہ کر حضرت خدیجہؓ نے یوں تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی تھی مگر ان الفاظ سے یہ بھی پایا جاتا ہے کہ سب سے پہلے آپ پر ایمان لانے والی حضرت خدیجہؓ ہی تھیں۔ ان کے الفاظ تو آپ کی تسلی دلانے کے لئے تھے مگر اِس کے معنی یہ تھے کہ یَارَسُوْلَ اللّٰہ! میں آپ پر ایمان لاتی ہوں اور جو تعلیم آپ کو خدا تعالیٰ کی طرف سے دی گئی ہے اُس کو بالکل سچ اور صحیح تسلیم کرتی ہوں اور اس میں مجھے ذرہ بھر بھی شبہ نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ سے مانگنے پر ایک مددگار ملا تھا مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان دیکھو کہ آپ کو بن مانگے مددگار مل گیا یعنی آپ کی وہ بیوی جس کے ساتھ آپ کو بے حد محبت تھی سب سے پہلے آپ پر ایمان لے آئی چونکہ ہر شخص کا مذہب اور عقیدہ آزاد ہوتا ہے اور کوئی کسی کو جبراً منوا نہیں سکتا اس لئے ممکن تھا کہ جب آپ نے حضرت خدیجہؓ سے خدا تعالیٰ کی پہلی وحی کا ذکر کیا تو وہ آپ کا ساتھ نہ دیتیں اور کہہ دیتیں کہ میں ابھی سوچ سمجھ کر کوئی قدم اُٹھاؤں گی لیکن نہیں حضرت خدیجہ نے بلا تأمل بلا توقف اور بلا پس و پیش آپ کے دعویٰ کی تائید کی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فکر کہ ممکن ہے خدیجہ مجھ پر ایمان نہ لائے جاتا رہا اور سب سے پہلے ایمان لانے والی حضرت خدیجہ ہی ہوئیں۔ اُس وقت خدا تعالیٰ عرش

پر بیٹھا کہہ رہا تھا اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ اے محمد ﷺ! تجھے خدیجہ کے ساتھ پیار تھا اور محبت تھی اور تیرے دل میں یہ خیال تھا کہ کہیں خدیجہ تجھے چھوڑ نہ دے اور تُو اِس فکر میں تھا کہ خدیجہ مجھ پر ایمان لاتی ہے یا نہیں مگر کیا ہم نے تیری ضرورت کو پورا کیا یا نہ کیا؟

اس کے بعد جب آپ کے گھر میں خدا تعالیٰ کی وحی کے متعلق باتیں ہوئیں تو زید بن حارث غلام جو آپ کے گھر میں رہتا تھا آگے بڑھا اور اس نے کہا یَا رَسُوْلَ اللّٰه! میں آپ پر ایمان لاتا ہوں۔ اس کے بعد حضرت علیؓ جن کی عمر اُس وقت گیارہ سال کی تھی اور وہ ابھی بالکل بچہ ہی تھے اور وہ دروازہ کے ساتھ کھڑے ہو کر اِس گفتگو کو سن رہے تھے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہؓ کے درمیان ہو رہی تھی، جب انہوں نے یہ سنا کہ خدا کا پیغام آیا ہے تو وہ علیؓ جو ایک ہونہار اور ہوشیار بچہ تھا، وہ علیؓ جس کے اندر نیکی تھی، وہ علیؓ جس کے نیکی کے جذبات جوش مارتے رہتے تھے مگر نشو ونما نہ پا سکے تھے، وہ علیؓ جس کے احساسات بہت بلند تھے مگر ابھی تک سینے کے اندر دبے ہوئے تھے اور وہ علیؓ جس کے اندر اللہ تعالیٰ نے قبولیت کا مادہ ودیعت کیا تھا مگر ابھی تک اسے کوئی موقع نہ مل سکا تھا اس نے جب دیکھا کہ اب میرے جذبات کے اُبھرنے کا وقت آ گیا ہے، اس نے جب دیکھا کہ اب میرے احساسات کے نشو ونما کا موقع آ گیا ہے، اس نے جب دیکھا کہ اب خدا مجھے اپنی طرف بُلا رہا ہے تو وہ بچہ سا علیؓ اپنے درد سے معمور سینے کے ساتھ لجاتا اور شرماتا ہوا آگے بڑھا اور اُس نے عرض کیا کہ یَا رَسُوْلَ اللّٰه! جس بات پر میری چچی ایمان لائی ہے اور جس بات پر زید ایمان لایا ہے اُس پر میں بھی ایمان لاتا ہوں۔[11]

اس کے آگے چل کر دوستوں کا مقام آتا ہے۔ آپ کے قریب ترین دوست حضرت ابوبکرؓ تھے آپ کے باقی دوست اگر اس موقع پر آپ کو چھوڑ کر جاتے تو آپ کو ذرا بھی قلق نہ ہو سکتا تھا لیکن اگر حضرت ابوبکرؓ آپ کو چھوڑ جاتے تو آپ کو انتہائی رنج اور دُکھ ہوتا کیونکہ ان کے اندر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نیکی اور تقویٰ کی بُو آتی تھی اس لئے آپ کے دل میں بہت زیادہ احساس تھا کہ دیکھئے ابوبکرؓ اس موقع پر کیا قدم اُٹھاتا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ اس زمانہ میں پھیری کر کے سامان بیچا کرتے تھے اور جس دن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی الٰہی کا اعلان فرمایا

اُسی دن دوپہر کو حضرت ابوبکرؓ پھیری سے واپس آئے۔ ان کی واپسی تک یہ خبر سارے شہر میں سُرعت کے ساتھ پھیل چکی تھی دشمن تو ایسی باتوں کو آن کی آن میں اُڑا دیتے ہیں۔ سارے شہر میں اِس کے متعلق چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کوئی کہتا تھا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پاگل ہو گیا ہے، کوئی کہتا تھا وہ اپنی عزت بڑھانا چاہتا ہے، اسی طرح جو کچھ کسی کے منہ میں آتا تھا کہہ دیتا تھا غرض یہ خبر آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل چکی تھی۔ ایک نے دوسرے سے ذکر کیا اور دوسرے نے تیسرے سے کہا ہر گھر میں یہی باتیں ہو رہی تھیں حضرت ابوبکرؓ جب دوپہر کے وقت تجارت سے واپس آئے اور مکہ میں پہنچے تو چونکہ شدت کی گرمی تھی اس لئے شہر کے ایک کنارے پر اپنے ایک دوست کے گھر میں پہنچے تا کہ ذرا ستالیں۔ انہوں نے اپنی گٹھڑی اُتاری اور پانی وغیرہ پی کر چادر اُتار کر لیٹنے ہی لگے تھے کہ اُن کے دوست کی بیوی سے نہ رہا گیا اور اُس نے کہا ہائے ہائے! اس بے چارے کا دوست پاگل ہو گیا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ لیٹتے لیٹتے اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے کس کا دوست؟ اُس عورت نے کہا تمہارا دوست محمد پاگل ہو گیا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے پوچھا تمہیں کس طرح معلوم ہوا کہ وہ پاگل ہو گیا ہے؟ وہ عورت کہنے لگی وہ کہتا ہے خدا کے فرشتے مجھ پر نازل ہوتے ہیں اور خدا مجھ سے ہمکلام ہوتا ہے۔ یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ اُسی وقت وہاں سے چل پڑے اور سیدھے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر پہنچے اور دروازہ پر دستک دی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آواز سے پہچان لیا کہ ابوبکرؓ آئے ہیں۔ آپ نے خیال کیا کہ ایسا نہ ہو کہ میرے یکدم بتا دینے سے ابوبکرؓ کو ٹھوکر لگ جائے کیونکہ حضرت ابوبکرؓ آپ کے نہایت قدیمی دوست تھے آپ نے جب دروازہ کھولا تو آپ کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار تھے حضرت ابوبکرؓ نے جب آپ کی یہ حالت دیکھی تو پوچھا کیا یہ بات سچ ہے کہ آپ پر خدا کا فرشتہ نازل ہوا ہے اور خدا تعالیٰ آپ سے ہمکلام ہوا ہے؟ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ اس خوف سے کہ ابوبکرؓ کو ٹھوکر نہ لگ جائے جلدی کوئی بات بتانے میں متأمل تھے اس لئے آپ نے فرمایا ابوبکرؓ! پہلے ذرا سن تو لو۔ بات یہ ہے کہ...... حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا میں اور کوئی بات سننا نہیں چاہتا میں تو یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ پر خدا کے فرشتے اُترے ہیں یا نہیں؟ اس پر آپ نے فرمایا۔ ابوبکر! ذرا میری بات تو سُن لو۔ یہ دیکھ کر حضرت ابوبکرؓ نے کہا میں آپ کو

خدا کی قسم دیتا ہوں کہ آپ کوئی بات نہ کریں بلکہ مجھے یہ بتائیں کہ کیا یہ سچ ہے کہ آپ نے کہا ہے کہ خدا آپ کے ساتھ باتیں کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ یہ سنتے ہی حضرت ابوبکرؓ نے کہا یَا رَسُوْلَ اللّٰہ ! میں آپ پر ایمان لاتا ہوں اور پھر کہا یَا رَسُوْلَ اللّٰہ ! کیا آپ دلیلیں دے کر میرے ایمان کو کمزور کرنے لگے تھے۔[۱۲]

اب دیکھو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا تھا کہ میں ابوبکرؓ کو دلائل دے کر منواؤں گا مگر خدا تعالیٰ عرش پر بیٹھا یہ نظارہ دیکھ رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ اے محمد! (ﷺ) ابوبکرؓ کو تیری دلیلوں کی ضرورت نہیں رہی ہم نے خود اس کو دلیلیں دے دی ہوئی ہیں اور وہ جس درجہ اور رُتبہ کا مستحق ہے ہم خود اُس کو کھینچ کر اس کی طرف لے آئیں گے۔ اب دیکھو اللہ تعالیٰ کی نصرت اور مدد کا یہ کیا شاندار نظارہ ہے۔ حضرت موسیٰ تو مانگ کر ایک مددگار لیتے ہیں مگر محمد رسول اللہ ﷺ کو خدا تعالیٰ چند منٹوں کے اندر اندر چار وفادار دے دیتا ہے۔

آپ کی اور حضرت موسیٰ کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کہتے کہیں کوئی بادشاہ سیر کو جا رہا تھا کہ اس نے رستہ میں دیکھا کہ ایک بڈھا جس کی عمر اسّی یا نوے سال کی ہے ایک درخت لگا رہا ہے اور وہ درخت کوئی اِس قسم کا تھا جو بہت لمبے عرصہ کے بعد پھل دیتا تھا بادشاہ نے سواری کو روک کر بڈھے کو بلایا اور کہا بوڑھے میاں! یہ درخت جو تم لگا رہے ہو یہ تو بہت لمبے عرصے کے بعد پھل دیتا ہے اِس سے تم کیا فائدہ اُٹھا سکتے ہو؟ بڈھا کہنے گا بادشاہ سلامت! بات یہ ہے کہ ہمارے باپ دادا نے درخت لگائے جن کے پھل ہم نے کھائے اب ہم درخت لگائیں گے جن سے آئندہ آنے والے پھل کھائیں گے اگر ہمارے باپ دادا بھی یہی خیال کرتے کہ ہم ان درختوں کا پھل نہیں کھا سکیں گے اور وہ درخت نہ لگاتے تو ہم پھل کیسے کھاتے اس لئے بادشاہ سلامت! یہ سلسلہ تو اسی طرح چلا آتا ہے کہ لگاتا کوئی ہے اور کھاتا کوئی ہے۔ بادشاہ نے یہ سن کر بڈھے کی عقل کی داد دیتے ہوئے کہا ''زِہ'' جس کا مطلب یہ تھا کہ کیا خوب بات کہی ہے اور بادشاہ نے اپنے خزانچی کو یہ حکم دے رکھا تھا کہ جب میں کسی بات پر خوش ہو کر زِہ کہوں تو اُسے یکدم تین ہزار درہم کی تھیلی دے دیا کرو اس لئے جب بادشاہ نے کہا زِہ تو خزانچی نے بڈھے کو

ایک تھیلی تین ہزار درہم کی دے دی۔ بڑھے نے تھیلی ہاتھ میں لے کر کہا بادشاہ سلامت! آپ تو کہتے تھے کہ تو اِس درخت کا پھل نہیں کھا سکے گا مگر دیکھئے اَور لوگوں کے درخت تو دیر کے بعد پھل دیتے ہیں اور میرے درخت نے لگاتے لگاتے ہی پھل دے دیا۔ اِس پر بادشاہ نے پھر خوش ہو کر کہا زِہ اور خزانچی نے پھر تھیلی تین ہزار کی بڑھے کو دے دی۔ بڑھے نے دوسری تھیلی لے کر کہا بادشاہ سلامت! لوگوں کے درخت تو سال میں ایک بار پھل دیتے ہیں مگر میرے درخت نے لگاتے لگاتے دو دفعہ پھل دے دیا۔ بادشاہ نے پھر خوش ہو کر کہا زِہ اور تیسری تھیلی بھی بڑھے کو دے دی گئی۔ اس پر بادشاہ نے ہمراہیوں سے کہا چلو جلدی یہاں سے نکل چلو ورنہ یہ بڑھا تو ہمارا خزانہ خالی کر دے گا۔ پس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وہی معاملہ ہوا جو اس بڑھے کے ساتھ ہوا تھا۔ حضرت موسیٰ کے دل میں تو وہ شبہ پیدا ہوا جو بادشاہ کے دل میں پیدا ہوا تھا کہ یہ درخت کب پھل دے گا مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امید کی وہ حالت تھی جو اس بڑھے کی تھی کہ اِدھر آپ پر خدا تعالیٰ کا کلام نازل ہوتا ہے اُدھر آپ کو نقد بہ نقد چار پھل مل جاتے ہیں۔ ایک حضرت خدیجہؓ آپ کی بیوی ایک زیدؓ آپ کا غلام، ایک حضرت علیؓ آپ کے بھائی اور ایک حضرت ابوبکرؓ آپ کے وفادار دوست۔ گویا یکدم آپ کے چاروں کونے محفوظ ہو جاتے ہیں اور تھوڑی سی دیر میں آپ کے اردگرد جاں نثاروں، وفاداروں اور محبت کرنے والوں کی ایک چھوٹی سی جماعت پیدا ہو جاتی ہے۔ اب دیکھو حضرت خدیجہؓ کو کس نے تبلیغ کی تھی؟ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو ابھی ڈر رہے تھے کہ کہیں میری بیوی میرے دعویٰ کا انکار نہ کر دے مگر خدیجہؓ کہتی ہیں میں آپ پر ایمان لاتی ہوں، زیدؓ کہتا ہے میں آپ پر ایمان لاتا ہوں، علیؓ کہتے ہیں میں آپ پر ایمان لاتا ہوں اور ابوبکرؓ کہتے ہیں میں آپ پر ایمان لاتا ہوں یہ ایمان لانے والے کوئی معمولی آدمی نہ تھے بلکہ ان میں سے ہر شخص درخشندہ اور تابندہ ستارہ تھا۔ وہ زمین پر پیدا ہوئے تھے مگر خدا تعالیٰ نے اُن کے نام آسمان پر فرشتوں کی فہرست میں لکھے ہوئے تھے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ حضرت خدیجہؓ پڑھی ہوئی تھیں مگر حضرت خدیجہؓ نے جو قربانی اسلام کے لئے کی کیا کوئی جاہل عورت ایسا کر سکتی ہے؟ اسی طرح حضرت زیدؓ نے جو قربانیاں اسلام کے لئے کیں وہ بھی اَظْهَرُ مِنَ الشَّمْسِ ہیں۔ اس طرح حضرت علیؓ کو جو

مرتبہ حاصل ہوا اور خدا تعالیٰ نے ان کو جو علم اور فہم عطا کیا وہ اس قدر اعلیٰ تھا کہ آج تک یورپ کے مؤرخین اُن کی عقل، سمجھ، تقویٰ اور طہارت کی تعریف کرتے ہیں۔ ایمان لانے کے وقت بے شک وہ بچہ تھے مگر اُن کے اندر قابلیت کا مادہ اور جوہر موجود تھا جسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نے اور بھی چار چاند لگا دیئے۔ اسی طرح حضرت ابوبکرؓ کو جو رُتبہ حاصل ہوا اور انہوں نے اسلام کے لئے جو قربانیاں کیں ان سے اہلِ اسلام تو ایک طرف، یورپین اور امریکی لوگ بھی واقف ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ عیسائی مستشرقین اور دوسرے متعصب مؤرخین اپنی کتابوں میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تو کئی قسم کے حملے کر جاتے ہیں لیکن حضرت ابوبکرؓ کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ ابوبکر ایسا نہ تھا۔ گویا جو دشمن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کرنے سے نہیں رُکتے وہ ابوبکرؓ کو نشانہ نہیں بناتے۔ پس حضرت ابوبکرؓ کوئی معمولی درجہ کے انسان نہ تھے ان کے تقویٰ اور اخلاص کا یہ عالم تھا کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بغیر کسی دلیل کے ایمان لے آئے تھے۔ انہوں نے رسول کریم ﷺ کی زبانی صرف یہ معلوم ہونے پر کہ آپ پر خدا کے فرشتے اُترتے ہیں بغیر کسی حیل و حجت کے آپ کے دعویٰ کی تصدیق کی اور بغیر کسی وقفہ کے آپ پر ایمان لے آئے۔ وہ اپنے اندر ایسی قابلیت اور ایسے جوہر رکھتے تھے جن کی مثال دنیا کی تاریخ پیش ہی نہیں کرسکتی۔ پس یہ ثبوت ہے اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ کی سچائی کا۔

اب ایک اور مرحلہ شروع ہوتا ہے جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ اسلام شروع کی تو کفارِ مکہ نے آپ کی سخت مخالفت کی اور انہوں نے سمجھا کہ محمد ﷺ کی باتیں صرف چند دن کی باتیں ہیں جب لوگ اِس کے پیچھے ہی نہ چلیں گے تو یہ خود بخود درست ہو جائے گا۔ کوئی کہتا تھا اِس کا دماغ خراب ہوگیا ہے کچھ دنوں کے بعد جب اس کا دماغ ٹھیک ہو جائے گا تو یہ خود ہی کہہ دے گا کہ میں غلطی کر رہا تھا مگر جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے دوست اور ان کے رشتہ دار خود ایک ایک، دو دو کر کے ان کو چھوڑ کر محمد رسول اللہ پر ایمان لا رہے ہیں اور ان میں ایسے لوگ جنہیں مکہ کا کلیجہ کہنا بجا ہوگا اُن کو چھوڑ کر آپؐ کے ساتھ ہو رہے ہیں اور بڑے بڑے خاندانوں کے نوجوان جن پر ان لوگوں کو بہت بڑی امیدیں تھیں اور وہ کہتے تھے کہ یہ محمد ﷺ کا

مقابلہ کریں گے وہ اُن کو چھوڑتے جا رہے ہیں تو اُن کو فکر پیدا ہوئی کہ یہ بات جسے ہم معمولی سمجھتے تھے دن بدن بڑھتی جا رہی ہے آخر انہوں نے مشورہ کیا کہ اب ان مسلمانوں کو ڈنڈے کے ساتھ سیدھا کرنا چاہئے۔ جیسے ہمارے ہاں زمیندار پنجابی زبان میں کہتے ہیں کہ ''میں تینوں ڈنڈے نال سدھا کرانگا'' یعنی اب میں تمہیں ڈنڈے کے ساتھ سیدھا کر دوں گا اسی طرح مکہ والوں نے بھی کہا کہ اب ہم مسلمانوں کو ڈنڈے کے ساتھ ٹھیک کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں پر ظلم کرنے شروع کر دیئے۔ ظلم کے وقت کسی جماعت کے امام یا لیڈر کی جو حالت ہوتی ہے وہ نہایت عجیب ہوتی ہے۔ جب کوئی خطرہ اور سختی کا وقت آتا ہے تو امام کے دل میں طرح طرح کے وساوس پیدا ہوتے ہیں کہ کہیں میرے پیرو سختی کو برداشت نہ کرتے ہوئے کمزوری نہ دکھا جائیں۔ میں بھی ایک جماعت کا امام ہوں مجھے ذاتی تجربہ ہے کہ امام کے لئے سب سے بڑا خطرہ یہ ہوتا ہے کہ اُس کی جماعت عین موقع پر کمزوری نہ دکھا جائے جہاں تک خدا کے خانہ کا تعلق ہے وہ سمجھتا ہے کہ خدا ہماری مدد کرے گا لیکن جب وہ بندوں کے خانہ کے متعلق سوچتا ہے تو وہ ڈرتا ہے کہ کہیں یہ لوگ کسی قسم کی کمزوری نہ دکھا جائیں۔ پس سب سے بڑا خطرہ کسی جماعت کے امام کو نازک موقع پر اپنی جماعت یا پیروؤں کے کمزوری دکھا جانے کے متعلق ہوتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے مالی لحاظ سے کمزور تھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ پر ایمان لانے والے نوجوانوں میں سے بہت سے ایسے بھی تھے جو بڑے بڑے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے اور بڑے بڑے رؤساء کے بیٹے تھے مگر چونکہ وہ خود جائدادوں کے مالک نہ تھے اِس لئے ان کو مالی لحاظ سے کمزور کہنا ہی درست ہوگا چنانچہ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ باوجود رؤساء کے بیٹے ہونے کے ماریں کھاتے تھے۔ حضرت زبیرؓ کا ظالم چچا ان کو چٹائی میں لپیٹ کر اُن کے ناک میں آگ کا دُھواں دیا کرتا تھا اور کہتا تھا کہ تم اسلام سے باز آ جاؤ مگر وہ جوانمرد بڑی خوشی کے ساتھ اس تکلیف کو برداشت کرتے اور کہتے کہ جب صداقت مجھ پر واضح ہو چکی ہے تو میں اس سے کس طرح انکار کر سکتا ہوں۔ اسی طرح حضرت عثمانؓ گو مُرَفَّہُ الحال آدمی تھے لیکن اُن کے چچا حکم بن ابی عاص نے ان کو رسیوں سے جکڑ کر پیٹا اور کہا تم محمد کے پاس نہ جایا کرو مگر انہوں نے کہا چچا! تم جتنا مرضی ہے مار لو میں صداقت کے اظہار سے

باز نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں میں بعض غلام بھی تھے اور غلاموں کے متعلق مکہ والوں کا قانون یہ تھا کہ مالک کو اپنے غلام پر پورا حق حاصل ہے وہ چاہے اسے مارے یا پیٹے یا قتل کر دے یا بھوکا رکھے یا پیاسا رکھے مالک کو حق حاصل تھا کہ وہ اپنے غلام کے ساتھ جو چاہے سلوک کرے اور جس طرح ایک مالک کو حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ جس طرح چاہے اپنے بیل کو جوتے وہ شام کو جوت لے یا صبح کو، دوپہر کو جوت لے یا آدھی رات کے وقت یا وہ اپنے اونٹ سے جس طرح چاہے کام لے اور اپنے گھوڑے پر جس وقت اور جس طرح چاہے سواری کرے اسی طرح غلاموں کے متعلق مکہ والوں کا قانون تھا کہ جب اور جس طرح مالک چاہیں اپنے غلاموں کے ساتھ سلوک کر سکتے ہیں۔ چنانچہ جو غلام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اُن کے مالکوں نے اُنہیں طرح طرح کی سزائیں دیں، قسم قسم کی اذیتیں دیں اور انواع واقسام کے دُکھ دیئے۔ آپ جب اِن مظالم کو دیکھتے تو آپ کے دل میں درد پیدا ہوتا تھا مگر مکہ کے قانون کے مطابق آپ اُن کی کوئی مدد نہ کر سکتے تھے۔ آپ پر ان مظالم کو دیکھ کر بڑا اثر ہوتا تھا اور ہونا چاہئے تھا کہ ان مظالم کی وجہ سے اور مصائب اور شدائد کی وجہ سے وہ لوگ کسی قسم کی کمزوری نہ دکھا جائیں۔ اور بجائے اس کے کہ وہ ایمان پر قائم رہ کر خدا تعالیٰ کے انعامات کے وارث ہوں اور خدا تعالیٰ کی رحمتوں کے مورد ہوں اُس کے غضب کے مورد نہ بن جائیں۔ ان غلاموں میں سے ایک حضرت بلالؓ بھی تھے ان کی زبان صاف نہ تھی اس لئے جب وہ اذان دیتے تھے تو بجائے اَشْھَدُ کے اَسْھَدُ کہتے تھے جب وہ نئے نئے مدینہ میں گئے اور انہوں نے اذان کہی اور اَشْھَدُ کی بجائے اَسْھَدُ کہا تو مدینہ کے لوگ جن کو اُن کی قربانیوں کا علم نہ تھا ہنس پڑے اُن کے نزدیک بلالؓ تو صرف ایک حبشی غلام تھا مگر انہیں کیا معلوم تھا کہ بلالؓ عرش پر کن انعامات کا مستحق قرار پا چکا ہے۔

ایک دن مدینہ کے لوگ بیٹھے آپس میں بلالؓ کے اَسْھَدُ کہنے کے متعلق باتیں کر رہے تھے اور ہنس رہے تھے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم لوگ بلالؓ کے اَسْھَدُ کہنے پر ہنستے ہو مگر خدا تعالیٰ عرش پر بلالؓ کے اَسْھَدُ کو پیار کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ غرض جب مکہ کے کفار نے مسلمانوں پر اور بالخصوص غلاموں پر مظالم ڈھانے شروع کئے تو حضرت بلالؓ کا مالک عین دوپہر

کے وقت جبکہ آسمان سے آگ برس رہی ہوتی تھی، جب کہ مکہ کا پتھریلہ میدان دہکتے ہوئے انگاروں سے بھی زیادہ گرم ہوتا تھا، جب کہ جھلس دینے والی گرمی پڑ رہی ہوتی تھی، جب تمازتِ آفتاب اپنے پورے شباب پر ہوتی تھی اور جب کہ زمین و آسمان کی حدّت مل جل کر زمین کے ذرّے ذرّے کو آگ سے بھی زیادہ گرم کررہی ہوتی تھی اُس وقت میں ان کے کپڑے اُتار کر ننگے بدن کے ساتھ زمین پر لٹا دیتا تھا اور بڑے بڑے بھاری پتھر جن میں سے شدتِ گرمی کی وجہ سے غبار سے اُٹھ رہے ہوتے تھے ان کے سینے پر رکھ دیتا تھا اور کہتا تھا اے بلالؓ! تُو محمد (ﷺ) کو چھوڑ دے اور لات اور عزیٰ کی پرستش کر ورنہ اسی طرح عذاب دے دے کر ماروں گا۔ اُس وقت وہ بلالؓ جس کے ہونٹوں پر پپڑی سی جمی ہوتی تھی، جس کی زبان پیاس کی وجہ سے تالو کے ساتھ لگ رہی ہوتی تھی، جس کی ننگی پیٹھ کا چمڑا جھلس رہا ہوتا تھا، جس کا سینہ گرم اور بھاری پتھروں کے بوجھ تلے جلا اور دبا جا رہا ہوتا تھا اور جس کا سر بھوک اور پیاس اور گرمی کی شدت سے چکرا رہا ہوتا تھا اُس کے اِنہی پپڑی جمے ہوئے ہونٹوں اور اسی تالو سے لگی ہوئی خشک زبان میں سے ایک آواز نکلتی تھی، ہاں اُس قریب المرگ اور موت کے بوجھ کے نیچے دے ہوئے انسان کے منہ سے ایک باریک سی آواز نکلتی تھی وہ آواز کیا ہوتی تھی وہ آواز ہوتی تھی اَحَدٌ اَحَدٌ [۱۳]

اُس وقت اللہ تعالیٰ عرش پر بیٹھا ہوا کہتا ہوگا اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ اے محمد! ﷺ تُو اِس پر ظلم ہوتے دیکھتا ہے اور تو چاہتا ہے کہ اِس کو چھڑا لے مگر تُو اُس کو چھڑا نہیں سکتا، اے محمد! تُو چاہتا ہے کہ اس کو تسلی دے مگر تو اس کو تسلی بھی نہیں دے سکتا مگر اے محمد! کیا میں موجود نہیں ہوں کہ اس کو تسلی دوں اور اس کی توحید کی تڑپ کو مضبوط کردوں اور اس کے ایمان میں زیادتی کر دوں؟

اس کے بعد قریش مکہ کے مظالم بڑھنے شروع ہوئے یہاں تک کہ حضرت ابوبکرؓ کو خیال آیا کہ یہاں سے کسی اور جگہ چلے جانا چاہئے جہاں امن اور چین کی زندگی بسر کی جاسکے اور جہاں آزادی کے ساتھ قرآن کریم کی تلاوت کی جا سکے اور جہاں آزادی کے ساتھ خدائے واحد کی پرستش کی جا سکے۔ حضرت ابوبکرؓ کے اس ارادہ کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہی ہوئی آپ کے لئے اتنے دیرینہ اور وفادار اور غمگسار دوست کی جدائی سخت تکلیف دہ تھی مگر آپ

مجبور تھے ورا ان کی کوئی مدد بھی نہ کر سکتے تھے مگر خدا تعالیٰ بھی اِس بات کو برداشت نہ کر سکتا تھا کہ آپ کا ایک وفادار اور گہرا دوست آپ سے جدا ہو جائے اور آپ کے دل کو رنج پہنچے۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ جب تیاری کر کے کہیں جانے لگے تو مکہ کے ایک رئیس نے اُن کو دیکھا اور کہا ابوبکر! کہیں سفر کی تیاریاں معلوم ہوتی ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا مکہ کے لوگوں نے ہم پر اتنا ظلم شروع کر دیا ہے کہ باوجود یکہ ہم ان کا کچھ نہیں بگاڑتے صرف اِس قصور پر کہ ہم خدائے واحد کی پرستش کرتے ہیں ہمیں خدا کا نام لینے سے روکا جاتا ہے۔ وہ رئیس جو حضرت ابوبکرؓ سے بات چیت کر رہا تھا وہ اسلام کا ایک شدید ترین دشمن تھا مگر خدائے تعالیٰ نے اس کو اپنا آلہ کار بنایا اور اس کے دل میں نرمی پیدا کر دی چنانچہ اس رئیس نے حضرت ابوبکرؓ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ابوبکر! تمہارے جیسا انسان جس شہر سے نکل جائے وہ شہر کبھی بچ نہیں سکتا وہ ضرور اُجڑ جائے گا تم کہیں جانے کا ارادہ ترک کر دو آؤ اور میرے ساتھ چلو تمہیں دکھ دینے والے پہلے مجھ سے نپٹیں گے پھر تمہارے پاس پہنچیں گے۔ چنانچہ اس رئیس نے اُسی وقت سارے شہر میں اعلان کرایا کہ اے لوگو! سن لو جس کسی نے ابوبکر کی طرف انگلی بھی اُٹھائی تو اُس کے لئے اچھا نہ ہوگا کیونکہ ابوبکر آج سے میری امان میں ہے[۱۴] اُس وقت جب کہ حضرت ابوبکرؓ تیاری کر کے شہر سے نکلے بھی اور واپس بھی آ گئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو یہ سمجھ رہے ہوں گے اور افسوس کر رہے ہوں گے کہ میرا ایک دیرینہ دوست مجھ سے جدا ہو گیا ہے مگر خدا تعالیٰ عرش پر بیٹھا کہہ رہا تھا اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ۔

مکہ والوں کے مظالم دن بدن بڑھتے گئے اور انہوں نے طرح طرح کے دکھ مسلمانوں کو دینے شروع کئے۔ غلاموں کو ان کے مالک سخت سے سخت سزائیں دیتے تھے اور دوسرے لوگوں کو ان کے رشتہ دار طرح طرح کے دکھ دیتے تھے۔ کسی کو اتنا مارا گیا کہ اسے ہلکان ہی کر دیا گیا، کسی کی آنکھیں نکال دی گئیں، کسی کو اتنا مارا جاتا کہ اس کے حواس مختل ہو جاتے، کسی کو گرم ریت پر لٹایا جاتا، کسی کو رسیوں سے جکڑ کر مارا جاتا اور کسی کو دہکتے ہوئے کوئلوں پر لٹایا جاتا غرض مسلمانوں کو ایسے ایسے دکھ دیئے جاتے جن کا تصور کر کے بھی انسان کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ غرض قریش مکہ کی عداوت بڑھی اور انہوں نے دکھ دینے کی نئی نئی

ترکیبیں نکالیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم گو غریب تھے مگر آپ کا خاندان مکہ کے اعلیٰ خاندانوں میں شمار ہوتا تھا اور آپ کا تعلق ایسے خاندان سے تھا جو خانہ کعبہ کے متولی تھے مگر لوگوں نے آپ پر بھی سختی کرنی شروع کردی۔ ایک دن آپ صفا اور مروہ پہاڑیوں کے درمیان ایک پتھر پر بیٹھے سوچ رہے تھے کہ کس طرح خدا تعالیٰ کی توحید کو قائم کیا جائے کہ اتنے میں ابوجہل آ گیا اور اس نے آتے ہی کہا محمدؐ! تم اپنی باتوں سے باز نہیں آتے یہ کہہ کر اس نے آپ کو سخت غلیظ گالیاں دینی شروع کیں۔ آپ خاموشی کے ساتھ اس کی گالیوں کو سنتے رہے اور برداشت کیا اور ایک لفظ تک منہ سے نہ نکالا۔ ابوجہل جب جی بھر کر گالیاں دے چکا تو اس کے بعد وہ بدبخت آگے بڑھا اور اس نے آپ کے منہ پر تھپڑ ماردیا مگر آپ نے پھر بھی اسے کچھ نہیں کہا آپ جس جگہ بیٹھے تھے اور جہاں ابوجہل نے آپ کو گالیاں دی تھیں وہاں سامنے ہی حضرت حمزہؓ کا گھر تھا۔ حمزہؓ ابھی تک ایمان نہیں لائے تھے ان کا معمول تھا کہ ہر روز صبح سویرے تیر کمان لے کر شکار کے لئے نکل جاتے تھے اور سارا دن شکار کھیلتے رہنے کے بعد شام کو واپس آ جایا کرتے تھے اور شام کو قریش کی مجالس کا دورہ کیا کرتے تھے۔ اُس دن بھی جس دن کہ ابوجہل نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیں اور تھپڑ مارا حمزہ باہر شکار کے لئے گئے ہوئے تھے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ جس وقت ابوجہل آپ پر بار بار حملہ کر رہا تھا تو حضرت حمزہؓ کی ایک لونڈی نے دروازہ میں کھڑے ہو کر یہ نظارہ دیکھا کہ ابوجہل بار بار آپ پر حملہ کر رہا ہے اور بے تحاشا گالیاں آپ کو دے رہا ہے اور آپ خاموشی اور سکون کے ساتھ اس کی گالیوں کو برداشت کر رہے ہیں۔ وہ لونڈی دروازے میں کھڑے ہو کر یہ سارا نظارہ دیکھتی رہی وہ بے شک ایک عورت تھی اور کافرہ تھی لیکن پرانے زمانہ میں جہاں مکہ کے لوگ اپنے غلاموں پر ظلم کرتے تھے وہاں یہ بھی ہوتا تھا کہ بعض شرفاء اپنے غلاموں کے ساتھ حسن سلوک بھی کرتے تھے اور آخر کافی عرصہ گزرنے کے بعد وہ غلام اسی خاندان کا ایک حصہ سمجھے جاتے تھے اسی طرح حضرت حمزہؓ کی وہ لونڈی بھی تھی اُس نے جب یہ سارا نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا تو اُس پر اِس کا بہت زیادہ اثر ہوا مگر وہ کر کچھ نہ سکتی تھی وہ دیکھتی اور سنتی رہی اور اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتی رہی اور جلتی رہی۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے اٹھ کر اپنے گھر تشریف

لے گئے تو وہ بھی اپنے کام کاج میں لگ گئی۔ شام کے وقت حمزہؓ اپنی سواری کو دوڑاتے ہوئے آئے اور روپچی بنے ہوئے تیر کمان کو ایک عجیب انداز سے پکڑے ہوئے دروازہ سے اندر آئے۔ اُس وقت ان کی چال ڈھال اس قسم کی تھی جیسے عام طور پر بڑے بڑے زمینداروں کے لڑکے کرتے ہیں۔ غرض وہ ایک عجیب تمکنت کے ساتھ سر کو اٹھائے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ اُس وقت ان کی اُٹھی ہوئی گردن ان کے خیالات کی ترجمانی کر رہی تھی کہ دیکھو میں کتنا بہادر اور دلیر ہوں اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ ان کی گردن ہر سامنے آنے والے کو دعوت دے رہی ہے کہ ہے کوئی بہادر جو میرے مقابلہ کی تاب لا سکے۔ جب وہ گھر میں داخل ہوئے تو ان کی وہ لونڈی جو بڑی دیر سے اپنے غصہ اور غم کے جذبات کو بمشکل دبائے بیٹھی تھی اس نے گرج کر کہا تمہیں شرم نہیں آتی کہ بڑے بہادر بنے پھرتے ہو۔ حمزہؓ یہ سن کر حیران رہ گئے اور تعجب سے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے؟ لونڈی نے کہا معاملہ کیا ہے تمہارا بھتیجا محمد (ﷺ) یہاں بیٹھا تھا کہ ابوجہل آیا اور اُس نے محمد پر حملہ کر دیا اور بے تحاشہ گالیاں دینی شروع کر دیں اور پھر اُس کے منہ پر تھپڑ مارا مگر محمد نے آگے سے اُف تک نہ کی اور خاموشی کے ساتھ سنتا رہا۔ ابوجہل گالیاں دیتا گیا اور دیتا گیا اور جب تھک گیا تو چلا گیا مگر میں نے دیکھا کہ محمد نے اس کی کسی بات کا جواب نہ دیا۔ تم بڑے بہادر بنے پھرتے ہو اور شکار کھیلتے پھرتے ہو تمہیں شرم نہیں آتی کہ تمہاری موجودگی میں تمہارے بھتیجے کے ساتھ یہ سلوک ہو رہا ہے۔ حمزہؓ اُس وقت مسلمان نہ تھے اور ریاست کی وجہ سے ان کا دل اسلام کو ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ یہ تو سمجھتے تھے کہ محمد (ﷺ) کی باتیں سچی ہیں مگر وہ اپنے جاہ و جلال اور شان و شوکت کو ایمان پر قربان کرنے کے لئے تیار نہ تھے مگر جب انہوں نے اپنی لونڈی کی زبانی یہ واقعہ سنا تو اُن کی آنکھوں میں خون اُتر آیا اور ان کی خاندانی غیرت جوش میں آئی چنانچہ وہ اسی طرح بغیر آرام کئے غصہ سے کانپتے ہوئے کعبہ کی طرف روانہ ہو گئے اور کعبہ کا طواف کرنے کے بعد اُس مجلس کی طرف بڑھے جس میں ابوجہل بیٹھا ہوا لاف زنی کر رہا تھا اور اُسی صبح والے واقعہ کو مزے لے کر بڑے تکبر کے ساتھ لوگوں کے سامنے بیان کر رہا تھا کہ آج میں نے محمد (ﷺ) کو یوں گالیاں دیں اور آج میں نے محمد کے ساتھ یوں کیا۔ حمزہؓ جب اس مجلس میں پہنچے تو انہوں نے جاتے ہی کمان بڑے

زور کے ساتھ ابوجہل کے سر پر ماری اور کہا تم اپنے بہادری کے دعوے کررہے ہو اور لوگوں کو سنا رہے ہو کہ میں نے محمد کو اس طرح ذلیل کیا ہے اور محمد نے اُف تک نہیں کی لے اب میں تجھے ذلیل کرتا ہوں اگر تجھ میں کچھ ہمت ہے تو میرے سامنے بول۔ ابوجہل اُس وقت مکہ کے اندر ایک بادشاہ کی سی حیثیت رکھتا تھا اس لئے جب اس کے ساتھیوں نے یہ ماجرا دیکھا تو وہ جوش کے ساتھ اُٹھے اور انہوں نے حمزہؓ پر حملہ کرنا چاہا مگر ابوجہل جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خاموشی کے ساتھ گالیاں برداشت کرنے کی وجہ سے اور حمزہؓ کی دلیری اور جرأت کی وجہ سے مرعوب ہوگیا تھا بیچ میں آ گیا اور ان کو حملہ کرنے سے روک دیا اور کہا تم لوگ جانے دو دراصل بات یہ ہے کہ مجھ سے ہی زیادتی ہوئی تھی اور حمزہؓ حق بجانب ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو جس وقت صفا اور مروہ کی پہاڑیوں سے واپس گھر آئے تھے اپنے دل میں یہ کہہ رہے تھے کہ میرا کام لڑنا نہیں ہے بلکہ صبر کے ساتھ گالیاں برداشت کرنا ہے مگر خدا تعالیٰ عرش پر کہہ رہا تھا اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ اے محمد! ﷺ تو لڑنے کے لئے تیار نہیں مگر کیا ہم موجود نہیں ہیں جو تیری جگہ تیرے دشمنوں کا مقابلہ کریں؟ چنانچہ خدا تعالیٰ نے اُسی دن ابوجہل کا مقابلہ کرنے والا ایک جاں نثار آپ کو دے دیا اور حضرت حمزہؓ نے اسی مجلس میں جس میں کہ انہوں نے ابوجہل کے سر پر کمان ماری تھی اپنے ایمان کا اعلان کر دیا اور ابوجہل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تو نے محمد ﷺ کو گالیاں دی ہیں صرف اس لئے کہ وہ کہتا ہے کہ میں خدا کا رسول ہوں اور فرشتے مجھ پر اُترتے ہیں، ذرا کان کھول کر سن لو میں بھی آج سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین پر ہوں اور مَیں بھی وہی کچھ کہتا ہوں جو محمد کہتا ہے اگر تجھ میں ہمت ہے تو آ میرے مقابلہ پر۔ یہ کہہ کر حمزہؓ مسلمان ہو گئے۔ [۱۵]

اس کے بعد جب قریش مکہ نے دیکھا کہ بہت سے لوگ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں اور یہ بات ان کے قابو سے باہر ہو رہی ہے تو انہیں نے مسلمانوں کو انتہا درجہ کی تکلیفیں دینی شروع کیں اور اپنی ایذا رسانی کو کمال تک پہنچا دیا یہاں تک کہ مکہ کے اندر مسلمانوں کے لئے امن بالکل مٹ گیا۔ اُس وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو جمع کیا اور فرمایا اب دشمنوں کی طرف سے ہم پر اتنے ستم ڈھائے جا رہے ہیں جو ہماری حدِ برداشت سے باہر ہیں اس لئے

تم میں سے جن جن کے لئے ممکن ہو انہیں چاہئے کہ وہ حبشہ کی طرح ہجرت کر کے چلے جائیں میں نے سنا ہے وہاں کا بادشاہ عادل اور انصاف پسند ہے اور اس کی حکومت میں کسی پر ظلم نہیں ہوتا۔ صحابہؓ نے عرض کیا یَا رَسُوْلَ اللّٰہ اور آپ؟ آپ نے فرمایا مجھے ابھی تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہجرت کی اجازت نہیں ملی۔ چنانچہ آپ کے ارشاد کے ماتحت بہت سے صحابہؓ ہجرت کر کے حبشہ کی طرف چلے گئے۔ اِس پر قریش مکہ کے دلوں میں پھر جوش پیدا ہوا اور انہوں نے کہا مسلمان تو بچ کر یہاں سے نکل گئے اور ہمارے پنجہ سے بچ گئے چنانچہ رؤسائے مکہ نے باہم مشورہ کر کے اپنے دو ممتاز رئیسوں یعنی عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ربیعہ کو حبشہ کی طرف روانہ کیا اور ان کے ساتھ بادشاہِ حبشہ اور اس کے وزراء اور درباریوں کے لئے تحفے تحائف روانہ کئے۔ یہ وفد نجاشی کے دربار میں پہنچا اور تحفے تحائف پیش کرنے کے بعد کہا اے بادشاہ! آپ ہمارے بھائی ہیں ہمارے ملزم بھاگ کر آپ کی حکومت میں پہنچ چکے ہیں ہم چاہتے ہیں کہ آپ ان کو واپس کر دیں تا کہ ہم ان کو ساتھ لے جائیں یہ لوگ جو بھاگ کر آئے ہیں انہوں نے اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر ایک نیا دین اختیار کر لیا ہے اور یہ سخت فسادی لوگ ہیں اس لئے ہم آپ سے یہ امید کرتے ہیں کہ آپ ہمارے مجرموں کو اپنی پناہ میں نہیں رکھیں گے۔ درباریوں نے بھی اس وفد کی پُر زور تائید کی لیکن نجاشی جو عادل اور رحم دل اور بیدار مغز حکمران تھا اُس نے کہا مجھے پہلے تحقیقات کر لینے دو وہ لوگ میری پناہ میں آئے ہیں جب تک میں ان کے بیانات نہ سُن لوں آپ کے حق میں یکطرفہ فیصلہ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ بادشاہ نے مسلمان مہاجرین کو دربار میں طلب کیا اور اُن سے پوچھا یہ کیا معاملہ ہے؟ اس پر حضرت جعفر بن ابی طالبؓ نے مسلمانوں کی طرف سے جواب دیا۔ اے بادشاہ! ہم پہلے جاہل تھے اور بت پرستی کرتے تھے ہم ہر قسم کی بدیوں اور بدکاریوں میں مبتلا تھے خدا تعالیٰ نے اپنا رسول ہم میں بھیجا جس نے ہمیں توحید سکھلائی اور بت پرستی سے روکا ہم اُس پر ایمان لائے اور اُس کی اتباع کر کے خدائے واحد کی پرستش کرنے لگے، اس پر ہماری قوم ناراض ہوگئی ہمیں انواع واقسام کی تکلیفوں اور دکھوں میں مبتلا کر دیا اور ہمیں خدا کی عبادت سے روکنا چاہا اور جب یہ ظلم حدِ برداشت سے بڑھ گئے تو ہمارے آقا نے ہمیں حکم دیا کہ تم لوگ حبشہ کی طرف ہجرت کر جاؤ کیونکہ حبشہ کا بادشاہ عادل ہے

اور اس کی حکومت میں کسی پر ظلم نہیں ہوتا چنانچہ ہم یہاں آ گئے اس لئے اے بادشاہ! ہم امید کرتے ہیں کہ آپ کے ماتحت ہم پر ظلم نہ ہوگا۔ بادشاہ حضرت جعفرؓ کی اس تقریر سے بہت متأثر ہوا اور کہنے لگا اچھا وہ کلام جو تمہارے رسول پر اُترا ہے مجھے بھی سناؤ۔ اِس پر حضرت جعفرؓ نے نہایت خوش الحانی اور رقت کے ساتھ سورہ مریم کی ابتدائی آیات تلاوت کیں جن کو سُن کر نجاشی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور اُس نے کہا خدا کی قسم! یہ کلام اور ہمارے مسیح کا کلام ایک ہی طرح کا ہے۔ اس کے بعد وہ قریش مکہ کے وفد سے کہنے لگا جاؤ میں تمہارے ساتھ ان لوگوں کو کبھی نہ بھیجوں گا یہ کہہ کر نجاشی نے ان کے تحفے بھی واپس کر دیئے۔ قریش کا وفد یہ دیکھ کر کہ ہمیں ناکامی اور نامرادی کا سامنا ہوا ہے سخت نادم ہوا مگر انہوں نے ایک چال چلی کہ وہ دوسرے دن پھر دربار میں حاضر ہوئے اور کچھ عیسائی پادریوں کو بھی تحفے وغیرہ دے کر ساتھ لے گئے اور بادشاہ سے کہا اے بادشاہ! کیا آپ جانتے ہیں کہ یہ پناہ گزیں آپ کے نبی حضرت مسیح کے متعلق کیا عقیدہ رکھتے ہیں؟ نجاشی نے مسلمانوں کو پھر بُلوایا اور پوچھا تم لوگ مسیحؑ کے متعلق کیا عقیدہ رکھتے ہو؟ حضرت جعفرؓ نے عرض کیا اے بادشاہ! ہمارے اعتقاد کی رو سے حضرت عیسیٰ خدا تعالیٰ کا ایک مقرب بندہ اور سچا رسول تھا مگر خدا نہ تھا اسی طرح حضرت مسیحؑ کی والدہ نیک اور پارسا عورت تھیں مگر خدا نہ تھیں۔ یہ سن کر نجاشی کہنے لگا یہ لوگ بالکل ٹھیک کہتے ہیں میں بھی مسیحؑ کو خدا نہیں مانتا۔ اُس وقت پادری جوش میں آ گئے اور کہا آپ نے عیسائیت کی ہتک کی ہے ہم عوام کو آپ کے خلاف اُکسائیں گے اور آپ کی بادشاہت خطرہ میں پڑ جائے گی۔ بادشاہ نے کہا جب میں بچہ تھا اور دوستوں نے میرا ساتھ چھوڑ دیا تھا تو اُس وقت بھی خدا تعالیٰ نے میری مدد کی تھی اور اب بھی میں اُسی پر امید رکھتا ہوں تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو بے شک کرو۔[۱۶] یہ اشارہ نجاشی نے ایک پُرانے واقعہ کی طرف کیا تھا اور وہ یہ کہ نجاشی ابھی بچہ ہی تھا کہ اس کا والد فوت ہو گیا اس لئے اس کے چچا کو عارضی طور پر بادشاہ بنایا گیا تا کہ نجاشی کی بلوغت تک وہ بادشاہت کے کام کو سرانجام دے مگر جب نجاشی جوان ہوا تو چچا نے خیال کیا کہ میں اتنے عرصہ سے بادشاہت کر رہا ہوں اب اس کو کیوں دے دوں۔ چنانچہ اُس کے اور اُس کے چچا کے درمیان تنازعہ ہوا نوجوانوں نے نجاشی کا ساتھ دیا اور اُس کا چچا حکومت سے

دستبردار ہو گیا۔ نجاشی نے اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ خدا جس نے اُس وقت میری مدد کی تھی اب بھی میری مدد کرے گا تم جاؤ اور زور لگا لو۔ غرض نجاشی نے اس وفد کو ناکام و نامراد واپس کر دیا۔ اُس وقت جب کہ قریش مکہ کا وفد مسلمان مہاجرین کی واپسی کے لئے مطالبہ کرنے کے لئے حبشہ گیا تھا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل دھڑک رہا ہوگا کہ خدا جانے ان بیچارے وطن سے دُور اُفتادگان کے ساتھ نجاشی کیا سلوک کرتا ہے مگر اُس وقت اللہ تعالیٰ عرش پر بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ اے محمد! ﷺ کیا میں اپنے بندے کے لئے کافی نہیں ہوں؟

(فرمودہ ۲۹ رجون ۱۹۴۷ء)

میں اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ کی تفسیر بیان کر رہا تھا جس میں میں نے ہجرتِ حبشہ تک کے واقعات بیان کئے تھے۔ ہجرتِ حبشہ کے بعد کفار مکہ کی طبائع میں بہت زیادہ مخالفت کا جوش پیدا ہو گیا کیونکہ وہ حبشہ سے ناکام و نامراد واپس لَوٹ آئے تھے اور نجاشی نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا دراصل حبشہ سے ناکام واپسی نے ان کو ایک نہیں بلکہ دو وجوہات کی بناء پر مسلمانوں کی اور بھی زیادہ مخالفت کرنے پر آمادہ کر دیا تھا۔ ایک وجہ تو اس کی یہ تھی کہ مسلمانوں کا ایک حصہ بالکل بچ کر ان کے ہاتھ سے نکل گیا تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ ایک غیر ملک میں جا کر انہی مسلمانوں کے سامنے جن کو وہ لوگ ملک میں طرح طرح کی تکلیفیں دیا کرتے تھے انہیں خود ذلیل ہونا پڑا یہ ذلت کفارِ مکہ کے لئے کوئی معمولی بات نہ تھی اور اس کا برداشت کر لینا ان کے لئے آسان نہ تھا اس لئے انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب مکہ کے مسلمانوں کو ہر ممکن طریق سے دکھ دیئے جائیں اور کوئی ظلم اب نہ رہ جائے جس سے ان کو دوچار نہ ہونا پڑے۔ اس ضمن میں وہ لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے بھی منصوبے سوچنے لگے اور آپ کے قاتل کے لئے انعامات مقرر کئے جانے لگے۔ ان انعامات مقرر کرنے والوں میں حضرت عمرؓ بھی تھے جو ابھی تک ایمان نہیں لائے تھے۔ ایک دن کسی نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ تم دوسروں کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے لئے انعامات دیتے پھرتے ہو خود یہ کام کیوں نہیں کرتے جبکہ تم اتنے بہادر اور دلیر ہو۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ کی رگِ حمیت پھڑک اُٹھی اور وہ تلوار

ہاتھ میں لے کر کھڑے ہو گئے اور اُسی وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے لئے چل پڑے۔ راستہ میں انہیں کوئی دوست مل گیا اُس نے جو انہیں غیظ و غضب کے عالَم میں ننگی تلوار اپنے ہاتھ میں لئے جاتے دیکھا تو وہ راستہ روک کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا عمرؓ! آج کہاں کا ارادہ ہے؟ انہوں نے کہا محمد (ﷺ) کو قتل کرنے جا رہا ہوں اس نے بڑا فتنہ برپا کر رکھا ہے۔ وہ ہنس کر کہنے لگا تم محمد کو تو قتل کرنے جا رہے ہو مگر تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ تمہارے اپنے گھر میں کیا ہو گیا ہے۔ کہنے لگے کیا ہوا ہے؟ اس نے کہا تمہاری تو اپنی بہن اور بہنوئی دونوں مسلمان ہو چکے ہیں۔ وہ یہ سن کر اور زیادہ برافروختہ ہوئے اور کہنے لگے اچھا پہلے انہی کو ٹھکانے لگا آتا ہوں۔ چنانچہ وہ جلدی جلدی قدم اُٹھاتے اپنی بہن کے گھر پہنچے اور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کو زنجیر لگی ہوئی تھی اور اندر ایک صحابی انہیں قرآن کریم پڑھا رہے تھے۔ اُنہوں نے عمر کی آواز سُنی تو اس صحابی کو کہیں چھپا دیا، قرآن کریم کے اوراق بھی اندر رکھ دیئے اور خود دروازہ کھول دیا۔ حضرت عمرؓ جو قرآن کریم کی تلاوت کی آواز سن چکے تھے انہوں نے آتے ہی بڑے جوش سے کہا کہ میں نے سنا ہے تم دونوں صابی ہو گئے ہو اور تم نے محمد کی پیروی اختیار کر لی ہے؟ اور یہ کہتے ہی وہ اپنے بہنوئی پر جھپٹ پڑے اور انہیں مارنے لگ گئے۔ بہن اسے برداشت نہ کر سکی اور وہ اپنے خاوند کو بچانے کے لئے آگے بڑھی۔ حضرت عمرؓ کا ارادہ اپنی بہن پر حملہ کرنے کا نہیں تھا مگر چونکہ وہ درمیان میں آ گئیں اور وہ اُس وقت جوش کی حالت میں تھے اس لئے ایک مُکّا ان کی بہن کو بھی جا لگا اور ان کی ناک سے خون بہنے لگا۔ بہن کو زخمی دیکھ کر ان کے دل میں ندامت پیدا ہوئی کیونکہ عورت پر ہاتھ اُٹھانا اہلِ عرب کے نزدیک ایک سخت معیوب فعل تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی خفت دور کرنے کے لئے کہا اچھا ان باتوں کو جانے دو اور مجھے بتاؤ کہ تم کیا پڑھ رہے تھے۔ اُن کی بہن بھی اُس وقت جوش کی حالت میں تھیں اور پھر وہ بہن بھی عمرؓ کی ہی تھیں کہنے لگیں تم ناپاک ہو جب تک تم غسل نہ کر لو میں تمہیں ان مقدس اَوراق کو ہاتھ تک نہیں لگانے دوں گی۔ چونکہ حضرت عمر اپنی بہن کی دل جوئی کرنا چاہتے تھے انہوں نے غسل کیا اور پھر کہا اب تو مجھے وہ اَوراق دکھا دو۔ اُن کی بہن نے وہ اوراق ان کے سامنے رکھ دیئے اور انہوں نے اُن کو پڑھنا شروع کر دیا اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان کے دل کے

پردے دُور ہونے شروع ہوگئے۔ جب وہ اِس آیت پر پہنچے کہ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ [۱۷] کہ ان کا سینہ کھل گیا اورانہوں نے کہا یہ تو عجیب کلام ہے مجھے جلدی بتاؤ کہ محمد رسول اللہ کہاں ہیں مَیں ان پر ایمان لانا چاہتا ہوں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُن دنوں دارِارقم میں تشریف رکھتے تھے آپ کو پتہ بتایا گیا اور وہ سیدھے اس مکان کی طرف چل پڑے مگر حالت یہ تھی کہ ابھی ننگی تلوار اُن کے ہاتھ میں تھی۔ حضرت عمرؓ نے دروازہ پر دستک دی تو صحابہؓ نے جھانک کر دیکھا کہ باہر کون ہے۔ انہیں جب عمرؓ کی شکل نظر آئی اور یہ بھی دیکھا کہ انہوں نے تلوار سونتی ہوئی ہے تو وہ گھبرائے کہ کہیں کوئی فساد پیدا نہ ہو جائے مگر حضرت حمزہؓ جو اُس وقت تک اسلام لا چکے تھے انہوں نے کہا ڈرتے کیوں ہو دروازہ کھولو اگر عمرؓ اچھی نیت سے آیا ہے تو خیر ورنہ اسی تلوار سے ہم اس کی گردن اُڑا دیں گے۔ چنانچہ دروازہ کھولا گیا اور عمرؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دیکھتے ہی فرمایا عمر! کس نیت سے آئے ہو؟ اُنہوں نے کہا یَا رَسُوْلَ اللّٰہ! ایمان لانے کے لئے۔ یہ سن کر آپ نے خوشی سے اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہا اور ساتھ ہی صحابہؓ نے اس زور سے نعرۂ تکبیر بلند کیا کہ دور دور تک مکہ میں اس کی آواز گونج اُٹھی۔ [۱۸]

اب دیکھو عمرؓ تو اس ارادہ اور نیت کے ساتھ اپنے گھر سے نکلے تھے کہ میں آج محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر کے دم لوں گا مگر اُس وقت خدا تعالیٰ عرش پر بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا کہ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ کیا خدا اپنے بندے کی حفاظت کے لئے کافی نہیں؟ چنانچہ وہی عمر جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مارنے کے لئے اپنے گھر سے نکلا تھا اسلام کی تلوار سے خود گھائل ہوگیا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی میں ہمیشہ کے لئے داخل ہوگیا۔ حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے بعد وہ عبادتیں جو پہلے چھپ کر ہوا کرتی تھیں سرِ عام ہونے لگیں۔ خود حضرت عمرؓ دلیری کے ساتھ کفار میں پھرتے تھے اور ان سے کہتے تھے کہ اگر تم میں سے کسی کے اندر طاقت ہے تو میرے سامنے آئے مگر کسی شخص کو اُن کے سامنے آنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی لیکن حضرت عمرؓ کا یہ رُعب صرف چند دن ہی رہا بعد میں حضرت عمرؓ

کی بھی وہی حالت ہوگئی جو دوسرے مسلمانوں کی تھی ۔ چنانچہ ایک موقع پر جب ان سے کسی نے پوچھا کہ کیا آپ کو اسلام لانے پر دشمنوں کی طرف سے تکلیفیں نہ دی جاتی تھیں؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ مجھے بھی کئی دفعہ دشمنوں نے مارا تھا مگر باقی مسلمان تو خاموشی کے ساتھ مار کھا لیتے تھے اور میں اُن کا مقابلہ کرتا تھا اور کبھی مار کھا لیتا تھا اور کبھی مار بھی لیتا تھا۔

پھر کفارِ مکہ کی مخالفت اور تیز ہوئی اور انہوں نے ایک میٹنگ میں یہ فیصلہ کیا کہ جس طرح بھی ہو سکے محمد (ﷺ) کو ابو طالب کی حفاظت اور ہمدردی سے محروم کر دیا جائے کیونکہ ہم ابو طالب کی وجہ سے محمد (ﷺ) کو کچھ کہہ نہیں سکتے اور ابو طالب کے لحاظ کی وجہ سے ہمیں محمد کا بھی لحاظ کرنا پڑتا ہے اس لئے اس معاملہ کو ابو طالب کے سامنے پیش کیا جائے اور کہا جائے کہ یا تو تم اپنے بھتیجے کو سمجھاؤ ورنہ اُس کی حفاظت اور ہمدردی سے دست بردار ہو جاؤ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو ساری قوم تمہاری مخالف ہو جائے گی اور تمہیں اپنا سردار تسلیم کرنے سے انکار کر دے گی ۔ یہ پہلا نوٹس تھا جو ابو طالب کو دیا جانے والا تھا اس سے پہلے انہیں سردارانِ قریش کی طرف سے اِس قسم کا کوئی نوٹس نہ دیا گیا تھا۔ غرض قریش نے اپنے بڑے بڑے سرداروں کا ایک وفد ابو طالب کے پاس بھیجا اور کہا کہ آپ ہماری قوم میں معزز ہیں اس لئے ہم آپ سے یہ درخواست کرنے آئے ہیں کہ آپ اپنے بھتیجے کو سمجھائیں کہ وہ ہمارے بتوں کو بُرا بھلا نہ کہا کرے ہم نے آج تک بہت صبر کیا ہے مگر اب ہم مزید صبر نہیں کر سکتے ہمیں رِجْس، پلید، **شَرُّ الْبَرِيَّه** ، **سُفَهَاء** اور ذرّیت شیطان کہا جاتا ہے اور ہمارے بتوں کو جہنم کا ایندھن قرار دیا جاتا ہے پس یا تو آپ محمد (ﷺ) کو سمجھائیں اور اسے ان باتوں سے باز رکھیں ورنہ ہم آپ کو بھی اپنی لیڈری سے الگ کر دیں گے ۔ ابو طالب کے لئے یہ موقع نہایت نازک تھا وہ اپنی قوم میں نہایت معزز سمجھے جاتے تھے اور لوگ انہیں اپنا لیڈر تسلیم کیا کرتے تھے اور لیڈری کی خاطر بعض اوقات انسان اپنے عزیز ترین رشتہ داروں اور بیٹوں تک کو چھوڑنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے ۔ چنانچہ ابو طالب نے اپنی قوم سے مرعوب ہو کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بُلایا اور کہا اے میرے بھتیجے ! اب تیری باتوں کی وجہ سے قوم سخت مشتعل ہو چکی ہے اور اب معاملہ اِس حد تک پہنچ چکا ہے کہ قریب ہے کہ وہ لوگ کوئی سخت قدم اُٹھائیں جو تمہارے لئے اور میرے لئے

بھی تکلیف دہ ہو۔ تو نے ان کے عقلمندوں کو سفیہہ ، ان کے بزرگوں کو شَرُّالْبَرِیَّہ اور ان کے معبودوں کا نام ہیزمِ جہنم اور وَقُوْدُالنَّار رکھا ہے اور خود ان کو رِجْس اور پلید کہا ہے اس لئے میں محض تمہاری خیرخواہی کے لئے تمہیں یہ مشورہ دیتا ہوں کہ اس دشنام دہی سے باز آ جاؤ ورنہ میں اکیلا ساری قوم کے مقابلہ کی جرأت نہیں کرسکتا۔ ساری قوم کے رؤساء وفد کی صورت میں میرے پاس آئے ہیں اور انہوں نے مجھے کہا ہے کہ اب دو رستوں میں سے کوئی سا رستہ اپنے لئے تجویز کرلو۔ یا تو محمد (ﷺ) سے کہو کہ وہ ہمارے بتوں کو گالیاں نہ دیا کرے اور یا پھر اس کی حفاظت سے دستبردار ہو جاؤ اس لئے اے میرے بھتیجے! یہ موقع میرے لئے نہایت نازک ہے اور میرے لئے اپنی قوم کو چھوڑنا مشکل ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ابوطالب کی یہ باتیں سنیں تو آپ نے محسوس کیا کہ جس شخص نے میرے لئے آج تک اتنی تکلیفیں اُٹھائی ہیں اور جس نے میرے ساتھ وفا کے عہد کئے ہوئے ہیں یہ تعلقات آج ٹوٹتے نظر آ رہے ہیں اور دُنیوی اسباب کے لحاظ سے میرا یہ سہارا ابھی مخالفت کے بوجھ کے نیچے دَب رہا ہے۔ چنانچہ اِن باتوں کا خیال کر کے آپ چشم پُرآب ہوگئے اور فرمایا اے چچا! میں نے ان لوگوں کے بتوں کے حق میں جو کچھ کہا ہے وہ دشنام دہی نہیں ہے بلکہ اظہارِ حقیقت ہے اور میں اسی کام کے لئے دنیا کی طرف بھیجا گیا ہوں کہ ان لوگوں کی خرابیاں ان پر ظاہر کر کے انہیں راہ راست کی طرف بلاؤں۔ پس میں کسی مخالفت یا موت کے ڈر سے حق کے اظہار سے رُک نہیں سکتا میری زندگی تو اس کام کیلئے وقف ہو چکی ہے اس لئے اے چچا! میں آپ کے اور آپ کی قوم کے درمیان کھڑا نہیں ہونا چاہتا اگر آپ کو کسی تکلیف یا اپنی کمزوری کا خیال ہے تو میں آپ کو بخوشی اجازت دیتا ہوں کہ آپ مجھے اپنی پناہ میں رکھنے سے دستبردار ہو جائیں۔ باقی رہا احکامِ الٰہی کو ان لوگوں تک پہنچانے کا سوال تو میں اس کام سے کبھی رُک نہیں سکتا خواہ میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے خدا کی قسم! اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے ہاتھ میں چاند بھی لاکر رکھ دیں تب بھی میں اپنے اس فریضہ کی ادائیگی سے باز نہیں رہ سکتا[19] یہ باتیں کہتے وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر رقت کی سی حالت طاری تھی اور آپ یہ خیال فرما رہے تھے کہ میرے ساتھ وفا اور محبت کرنے والا میرے رشتہ داروں میں

سے یہی ایک میرا چچا تھا اور یہ رشتہ مروت بھی آج ٹوٹتا نظر آ رہا ہے مگر جس وقت آپ یہ خیال فرما رہے تھے کہ وفا، محبت اور مروت کا یہ رشتہ آج ٹوٹ رہا ہے اُس وقت اللہ تعالیٰ عرش پر کہہ رہا تھا اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ اے محمد! کیا ہم اپنے بندے کے لئے کافی نہیں ہیں؟ دشمنوں نے بے شک اپنا پورا زور لگا دیا ہے کہ یہ رشتہ ٹوٹ جائے، انہوں نے بے شک اپنی طرف سے پوری کوششیں کی ہیں کہ یہ رشتہ محبت قطع ہو جائے مگر اے محمد! ہم اس رشتے کو کبھی ٹوٹنے نہیں دیں گے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے ابوطالب کے دل کو نرم کر دیا اور وہ ابوطالب جسے قوم کی سرداری کو عزیز رکھنے کا خیال آ رہا تھا، وہ ابوطالب جسے قوم کی لیڈری کا خیال آ رہا تھا اُس کے اندر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت جوش مارنے لگی اور اُس نے رقت بھری آواز میں کہا اے میرے بھتیجے! جا اور اپنے کام میں اسی طرح لگا رہ جب تک میں زندہ ہوں اپنی طاقت کے مطابق تیرا ساتھ دوں گا۔ اب دیکھو کس طرح اللہ تعالیٰ نے اس نازک موقع پر اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ کا نمونہ دکھایا اور ابوطالب جو دنیادار آدمی تھے اور قریب تھا کہ وہ قوم کی سرداری اور لیڈری کی طرف جھک جائیں اللہ تعالیٰ نے اُن کے دل پر ایسا تصرف کیا کہ انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے مقابلہ میں قوم کی سرداری اور لیڈری کو بھی ترک کرنے پر آمادگی کا اظہار کر دیا۔

اس کے بعد کفارِ مکہ کی مخالفت اور بھی زیادہ تیز ہو گئی اور انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اب ابوطالب کو ایک آخری نوٹس دینا چاہئے چنانچہ وہ ایک میدان میں جمع ہوئے اور انہوں نے اپنا ایک نمائندہ ابوطالب کی طرف بھیجا اور کہلا بھیجا کہ ہم فلاں میدان میں جمع ہیں اور یہ ہماری طرف سے آخری نوٹس ہے۔ پہلے تو ہم نے صرف صلح کا نوٹس دیا تھا مگر اب ہم جنگ کا نوٹس دے رہے ہیں کہ جب تک تم محمد (ﷺ) کو ہمارے حوالہ نہ کر دو ہم یہاں سے ہرگز نہیں ہلیں گے ورنہ ساری قوم تمہارا اور مسلمانوں کا مقاطعہ کر دے گی۔ یہ وقت پھر ابوطالب کی آزمائش اور امتحان کا وقت تھا اور اِس نوٹس میں صرف یہی نہیں کہا گیا تھا کہ تمہاری قوم تمہیں چھوڑ دے گی بلکہ یہ دھمکی بھی دی گئی تھی کہ قوم تمہارا مقاطعہ کر دے گی گویا یہ آخری پتھر تھا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رستہ میں ڈالا گیا مگر خدا تعالیٰ کی قدرت دیکھو اِدھر ابوطالب

نے بنو ہاشم اور بنو مطلب کو جمع کیا اور سارے حالات ان کے سامنے رکھ کر کہا اب قوم کی مخالفت حد سے بڑھتی جا رہی ہے اور رؤسائے قریش نے مجھے دھمکی دی ہے کہ اگر تم نے محمد (ﷺ) کا ساتھ نہ چھوڑا تو تمہارا مقاطعہ کر دیں گے اس لئے ہمیں محمد (ﷺ) کی حفاظت کرنی چاہئے۔ ابوطالب کی اس تحریک پر سوائے ابولہب کے بنو ہاشم اور بنو مطلب کے باقی تمام لوگوں نے اتفاق کا اظہار کیا اور قومی غیرت کی وجہ سے وہ دوسروں کے مقابلہ پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اعانت کے لئے تیار ہو گئے اور خدا تعالیٰ کی حکمت کہ بنو ہاشم اور بنو مطلب کے وہ افراد بھی جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت تکالیف دیا کرتے تھے انہوں نے بھی عہد کیا کہ ہم بہر حال محمد (ﷺ) کا ساتھ دیں گے اور اس طرح پھر خدا تعالیٰ کا فضل نازل ہوا کہ صرف ابوطالب ہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے دوسرے دشمنوں کے منہ سے بھی کہلا دیا ہم محمد (ﷺ) کا ساتھ دیں گے چاہے قوم ہمارا مقاطعہ ہی کیوں نہ کر دے۔ چنانچہ ابوطالب نے ان پیغام بھیجنے والے رؤساء کو کہلا بھیجا کہ جو تمہارے جی میں آئے ہمارے ساتھ کرو میں کبھی محمد (ﷺ) کو تمہارے سپرد نہیں کر سکتا اور اس کی حمایت سے دست بردار نہیں ہو سکتا۔ اُس وقت جبکہ کفار مکہ نے اپنی تمام کوششیں صرف کر دی تھیں اور اُس وقت جب کہ انہوں نے ہر قسم کی دھمکیاں دے کر ابوطالب کو آپ کی حمایت سے ہٹانا چاہا تھا خدا تعالیٰ عرش پر کہہ رہا تھا اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ اے محمد! ﷺ تو دلگیر مت ہو۔ اے محمد! ﷺ تو کوئی اندیشہ مت کر اور اے محمد! ﷺ تجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہم خود تیرے دشمنوں کو ان کے ارادوں میں خائب و خاسر کر دیں گے اور اِنہیں دشمنوں میں سے کچھ لوگ ایسے تیار کر دیں گے جو اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر تمہاری حمایت کا اعلان کریں گے۔

پھر ایک عجیب بات ہے جس کی طرف پہلے کسی مؤرخ کا ذہن نہیں گیا صرف مجھے ہی خدا تعالیٰ نے سمجھائی ہے یہ ہے کہ وہی میدان جس میں کفارِ مکہ جمع ہوئے تھے اور اپنا نمائندہ بھیج کر ابوطالب سے مطالبہ کیا تھا کہ محمد (ﷺ) کو ہمارے حوالہ کر دو اسی میدان میں فتح مکہ کے وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی جھنڈے گاڑے اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے بتا دیا کہ اے کفار! تم یہاں جمع ہو کر محمد (ﷺ) کو بلاتے تھے اس لئے کہ تم جو چاہو اُس کے ساتھ

سلوک کرو اب ہم محمد (ﷺ) کو اسی میدان میں لائے ہیں اس لئے نہیں کہ جو سلوک تم چاہو اُس کے ساتھ سلوک کرو بلکہ اس لئے کہ محمد ﷺ جو سلوک چاہے تمہارے ساتھ کرے۔ تم تو محمد رسول اللہ کو اس لئے میدان میں مانگ رہے تھے کہ تم اس کے ساتھ جو چاہو وہ سلوک کر سکو اور ہم محمد ﷺ کا اُس میدان میں لے بھی آئے ہیں مگر اس لئے نہیں کہ تم جو چاہو اس کے ساتھ سلوک کرو بلکہ اس لئے کہ وہ جو چاہے تمہارے ساتھ سلوک کرے۔ غرض کفارِ مکہ کے مطالبہ کے مقابلہ میں پہلے تو اللہ تعالیٰ نے یہ معجزہ دکھایا کہ انہی مطالبہ کرنے والوں کے ساتھیوں اور شدید ترین دشمنوں میں سے کچھ لوگ الگ ہو گئے اور انہوں نے اعلان کیا کہ ہم محمد کو مطالبہ کرنے والوں کے سپرد نہیں کریں گے اور یہ کہنے والے وہی دشمن تھے جو ہر روز رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیا کرتے تھے اور آپ پر پتھراؤ کیا کرتے تھے اور دوسرا معجزہ اللہ تعالیٰ نے یہ دکھایا کہ وہ آپ کو اسی میدان میں لایا جہاں بیٹھ کر ائمۃ الکفر نے آپ کے خلاف میٹنگ کی تھی اور ابو طالب سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ محمد ﷺ کو اُن کے حوالے کر دیں مگر اس حالت میں کہ آپ کے ساتھ وہ سلوک نہ ہو جو مکہ والے آپ کے ساتھ کرنا چاہیں بلکہ مکہ والوں کے ساتھ وہ سلوک ہو جو آپ ان کے ساتھ کرنا چاہیں۔ غرض جب ابو طالب نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالبہ کرنے والے کفارِ مکہ کو کہلا بھیجا کہ میں اور میری قوم محمد کو تمہارے سپرد نہیں کر سکتے اس لئے تم لوگ جو چاہو ہمارے ساتھ کرو ہم اس کے مقابلہ کے لئے تیار ہیں، تو اس پر کفارِ مکہ نے ایک باقاعدہ معاہدہ لکھا کہ کوئی شخص بنو ہاشم اور بنو مطلب کے ساتھ کسی قسم کے تعلقات نہیں رکھے گا، کوئی شخص ان کے ساتھ رشتہ نہیں کرے گا، کوئی شخص نہ ان کے پاس کچھ فروخت کرے گا اور کوئی شخص نہ ان سے کچھ خریدے گا اور نہ ہی کوئی شخص کھانے پینے کی کوئی چیز ان کے پاس جانے دے گا جب تک وہ لوگ محمد کو ہمارے حوالہ نہ کر دیں۔ یہ معاہدہ باقاعدہ لکھ کر کعبہ کی دیوار کے ساتھ آویزاں کر دیا گیا۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور بنو ہاشم اور بنو مطلب کے تمام لوگ کیا مسلم اور کیا غیر مسلم شعب ابی طالب میں محصور ہو گئے اور شعب ابی طالب وہ جگہ تھی جو بنو ہاشم کا خاندانی درہ تھا اس میں وہ لوگ قیدیوں کی طرح نظر بند کر دیئے گئے اور مکہ کی عملی زندگی سے بالکل منقطع ہو گئے۔ اب دونوں طرف ہی ضد تھی ایک طرف تو یہ ضد تھی کہ جب تک

محمد (ﷺ) اپنی تعلیم کو نہیں چھوڑتا یا اُس کی قوم اُسے ہمارے حوالے نہیں کر دیتی ہم اس مقاطعہ کو برقرار رکھیں گے۔ دوسری طرف یہ ضد تھی اور اس کو ضد نہیں بلکہ استقلال کہنا چاہئے کہ چاہے ہمارے ساتھ کتنا ہی بُرا سلوک کیوں نہ روا رکھا جائے ہم ان کے مطالبہ کو تسلیم نہیں کر سکتے۔ گویا ایک طرف راج ہٹ تھی اور دوسری طرف دین ہٹ تھی اور یہ ہٹ کی دونوں قسمیں آپس میں مقابلہ کے لئے تُلی ہوئی تھیں۔ کفر چاہتا تھا کہ اسلام پر غالب آ جائے اور اسلام چاہتا تھا کہ کفر کو کھا جائے۔

شعب ابی طالب میں محصور ہونے کے ایام میں محصور ہونے والوں کو جو جو تکلیفیں اُٹھانی پڑیں ان کا حال پڑھ کر بدن پر لرزہ آ جاتا ہے۔ صحابہؓ کہتے ہیں کہ بعض اوقات انہوں نے غذا نہ ہونے کی وجہ سے جنگلی جانوروں کی طرح درختوں کے پتے کھا کھا کر گذارہ کیا اور بعض نے سوکھے ہوئے چمڑے کو پانی میں صاف اور نرم کر کے بھون کر کھا لیا۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کی یہ حالت ہوتی تھی کہ بھوک کی وجہ سے ان کے رونے اور چیخنے کی آوازیں دور دور تک سنائی دیتی تھیں اور یہ تکلیف کوئی ہفتہ دو ہفتہ یا مہینہ دو مہینہ کے لئے نہ تھی بلکہ ایک لمبے عرصہ کے لئے تھی اور حالت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ صحابہؓ کہتے ہیں بجائے پاخانہ کے ہم مینگنیاں کرتے تھے مگر دونوں فریق اپنی اپنی ہٹ پر قائم تھے۔ ایک طرف یہ ضد تھی کہ اسلام ہمارے سامنے سرنگوں ہو جائے اور دوسری طرف استقلال کا یہ عالم تھا کہ وہ کہتے تھے کہ چاہے اس رستہ میں ہماری جانیں بھی کیوں نہ چلی جائیں ہم اپنے منصب کو ترک نہیں کر سکتے۔ اب پھر اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ میں دخل دیا اور وہ اس طرح کہ قریش کے اندر بعض نرم دل اور شریف الطبع لوگ بھی تھے جو اس ظالمانہ معاہدہ کو دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتے تھے مگر وہ قوم کے مقابلہ کی تاب نہ رکھتے تھے۔ آخر جب انہوں نے دیکھا کہ ظلم حد سے بڑھ رہا ہے تو ان میں سے ایک نوجوان نے دلیری کی اور جرأت سے کام لیتے ہوئے چار پانچ اور نوجوانوں کو اپنے ساتھ لیا اور کہا یہ ظلم اب برداشت سے باہر ہوا جاتا ہے کیا اس سے بڑھ کر بھی ظلم کی کوئی حد ہو سکتی ہے کہ ہم لوگ تو یہاں آرام سے زندگی بسر کر رہے ہیں اور مسلمان بے چارے اور ان کے ساتھی اڑھائی سال سے بے آب و دانہ پڑے ہیں اور کوئی ان کا پُرسانِ حال نہیں۔ یہ کہہ کر وہ گئے اور معاہدہ کو جو

بوسیدہ ہو چکا تھا اُتار کر پھاڑ دیا اُس کے بعد انہوں نے تلواریں ہاتھ میں لیں اور شعب ابی طالب کے دروازے پر پہنچے اور محصورین کو اپنی تلواروں کی چھاؤں میں وہاں سے نکال لائے۔[۲۰] جب وہ نوجوان اس معاہدہ کے خلاف تلواریں لے کر کھڑے ہوئے تو اُس وقت اللہ تعالیٰ عرش پر کہہ رہا تھا اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ اے محمد ﷺ! کیا ہم اپنے بندے کے لئے کافی نہیں ہیں؟ اب دیکھو دشمنوں کو کس نے تحریک کی تھی کہ وہ اس معاہدہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں اور پھر اس کیڑے کو جس نے معاہدہ کا کاغذ کھایا تھا اور بوسیدہ کیا تھا کس نے تحریک کی تھی کہ وہ معاہدہ کو کھا جائے یہ محض خدا تعالیٰ کا فضل اور اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ کا نمونہ تھا۔

معاہدہ کی تحریر کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کہ آپ محصور تھے ایک دن اپنے چچا حضرت ابو طالب سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بتایا ہے ک وہ معاہدہ جو ہمارے خلاف لکھا گیا تھا اور کعبہ کی دیوار کے ساتھ آویزاں کیا گیا تھا اُس کا کاغذ کھایا جا چکا ہے۔ روایات میں لکھا ہے کہ ابوطالب فوراً خانہ کعبہ میں گئے جہاں بہت سے رؤسائے قریش مجلس لگائے بیٹھے تھے اور انہوں نے جاتے ہی کہا اے قریش! تمہارا یہ ظالمانہ معاہدہ کب تک چلے گا محمد نے مجھے بتایا ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس معاہدہ کی تحریر کو محو کر دیا ہے تم اس معاہدہ کو نکالو تا کہ دیکھیں کہ میرے بھتیجے کی بات کہاں تک درست ہے۔ چنانچہ معاہدہ دیوار سے اُتروا کر دیکھا گیا تو واقعی وہ سب کرم خوردہ ہو چکا تھا۔ اس پر قریش کے وہ شریف الطبع لوگ جو اس ظالمانہ معاہدہ کے خلاف ہو چکے تھے اور جن کے دل میں انصاف، رحم اور قرابت داری کے جذبات پیدا ہو رہے تھے ان کو معاہدہ کے خلاف آواز اُٹھانے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ چنانچہ انہوں نے کاغذ پھاڑ دیا اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔[۲۱]

اس کے بعد مکہ والوں نے فیصلہ کیا کہ محمد ﷺ کے ساتھ کوئی شخص بات چیت نہ کرے اور نہ اس کی بات کو سنے اور یہ آپ کے لئے نہایت تکلیف دہ تھا کیونکہ ایک نبی کے لئے سب سے بڑی تکلیف دہ بات یہ ہوتی ہے کہ لوگ اس کی بات نہ سنیں اور اس کے ساتھ نہ بولیں۔ خدا تعالیٰ کے نبی تو یہ چاہتے ہیں کہ خواہ لوگ اُن کو جی بھر کر گالیاں دے لیں مگر کم از کم اُس پیغام

کو تو سُن لیں جو وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے بنی نوع انسان کے لئے لائے ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کئی دفعہ ہم نے ایک واقعہ سنا ہے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ دشمن جب ہمیں گالیاں دیتے ہیں اور مخالفت کرتے ہیں تو ہمیں امید ہوتی ہے کہ ان میں سے سعید روحیں ہماری طرف آ جائیں گی لیکن جب نہ تو لوگ ہمیں گالیاں دیتے ہیں اور نہ ہی مخالفت کرتے ہیں اور بالکل خاموش ہو جاتے ہیں تو یہ بات ہمارے لئے تکلیف دِہ ہوتی ہے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ نبی کی مثال اُس بڑھیا کی سی ہوتی ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ کچھ پاگل سی تھی اور شہر کے بچے اُسے چھیڑا کرتے تھے اور وہ انہیں گالیاں اور بددعائیں دیا کرتی تھی آخر بچوں کے ماں باپ نے تجویز کی کہ بچوں کو روکا جائے کہ وہ بڑھیا کو دِق نہ کیا کریں چنانچہ انہوں نے بچوں کو سمجھایا مگر بچے تو بچے تھے وہ کب باز آنے والے تھے یہ تجویز بھی کارگر ثابت نہ ہوئی۔ آخر بچوں کے والدین نے فیصلہ کیا کہ بچوں کو باہر نہ نکلنے دیا جائے اور دروازوں کو بند رکھا جائے چنانچہ انہوں نے اِس پر عمل کیا اور دو تین دن تک بچوں کو باہر نہ نکلنے دیا۔ اس بڑھیا نے جب دیکھا کہ اب بچے اسے دِق نہیں کرتے تو وہ گھر گھر جاتی اور کہتی کہ تمہارا بچہ کہاں گیا ہے؟ کیا اسے سانپ نے ڈس لیا ہے؟ کیا وہ ہیضہ سے مر گیا ہے؟ کیا اس پر چھت گر پڑی ہے؟ کیا اس پر بجلی گر گئی ہے؟ غرض وہ ہر دروازہ پر جاتی اور اس قسم کی باتیں کرتی آخر لوگوں نے سمجھا کہ بڑھیا نے تو پہلے سے بھی زیادہ گالیاں اور بددعائیں دینی شروع کر دی ہیں اس لئے بچوں کو بند رکھنے کا کیا فائدہ اُنہوں نے بچوں کو چھوڑ دیا۔ آپ فرمایا کرتے تھے یہی حالت نبی کی ہوتی ہے۔ جب مخالفت تیز ہوتی ہے تب بھی اسے تکلیف ہوتی ہے اور جب مخالف چپ کر جاتے ہیں تب بھی اسے تکلیف ہوتی ہے کیونکہ جب تک مخالفت نہ ہو لوگوں کی توجہ الٰہی سلسلہ کی طرف پھر نہیں سکتی۔

غرض نبی کے لئے سب سے بڑی تکلیف دہ چیز یہی ہوتی ہے کہ لوگ اُس کی مخالفت چھوڑ دیں اور اُس کی باتیں نہ سنیں اس لئے جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ مکہ کے لوگ آپ کی باتیں نہیں سنتے اور نہ وہی آپ کے ساتھ بات چیت کرتے ہیں تو آپ نے ارادہ فرمایا کہ مکہ سے باہر کسی اور جگہ کے لوگوں کو تبلیغ کرنی چاہیئے چنانچہ آپ نے طائف جانے کا

ارادہ فرمایا۔ طائف ایک مشہور مقام ہے جو مکہ سے جنوب مشرق کی طرف چالیس میل کے فاصلہ پر ہے طائف میں بڑے بڑے صاحب اثر اور دولت مند لوگ آباد تھے وہ لوگ اپنے آپ کو بڑا جنگجو خیال کرتے تھے اور طائف کی بستی حجاز کی بہت بڑی چھاؤنی سمجھی جاتی تھی۔ غرض آپ طائف پہنچے اور آپ نے وہاں کچھ دنوں تک بڑے بڑے رؤساء کو تبلیغ کی مگر انہوں نے بھی اسلام کو نہ مانا بلکہ تمسخر سے کام لیا۔ طائف کے رئیس اعظم عبدیالیل نے اس خیال سے کہ کہیں آپ کی باتوں کا اثر شہر کے نوجوانوں پر نہ ہو جائے آوارہ گرد نوجوانوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ آپ پر پتھر برسائیں اور شہر کے کتے آپ کے پیچھے لگائیں اور آپ کو گالیاں دیں چنانچہ ان اوباشوں نے آپ کے پیچھے کتے لگا دیئے اور آپ کو سخت گالیاں دیں اور ساتھ ہی آپ پر پتھراؤ شروع کر دیا جس سے آپ کا سارا بدن خون سے تر بتر ہو گیا اور برابر تین میل تک ان اوباشوں نے آپ کا تعاقب کیا اور آپ پر پتھر برساتے آئے۔ طائف سے تین میل کے فاصلہ پر پہنچ کر ان لوگوں نے آپ کا پیچھا چھوڑا مگر اُس وقت تک آپ کا سارا جسم لہولہان ہو چکا تھا آپ اسی حالت میں تھے کہ خدا تعالیٰ کا فرشتہ آپ کے پاس آیا اور اُس نے کہا کہ خدا تعالیٰ نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے اور کہا ہے کہ اگر آپ حکم دیں تو میں ابھی یہ پہاڑ جو سامنے دکھائی دیتا ہے اسے طائف کی بستی پر اُلٹ دوں اور اس کو تباہ کر دوں۔ آپ نے فرمایا نہیں نہیں آخر انہی لوگوں نے ایمان لانا ہے اگر ان پر عذاب آ گیا اور یہ تباہ ہو گئے تو مجھ پر ایمان کون لائے گا۔[۲۲] یہ بھی اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ کا نمونہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے طائف والوں کے ظلم وستم کو دیکھ کر اپنے پہاڑوں کے فرشتہ کو آپ کے پاس بھیجا کہ اگر اجازت ہو تو طائف کی بستی کو تباہ کر دیا جائے یہ الگ بات ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرشتہ کو اس بات کی اجازت نہ دی اور وہ تباہی سے بچ گئے۔

کوئی نادان کہہ سکتا ہے کہ فرشتہ کا آنا ایک خیالی بات ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا آپ پر پہلے بھی کبھی فرشتہ کا نزول ہوا تھا یا نہیں اور پہلے بھی کبھی خدا تعالیٰ کی تائید اور نصرت آپ کے شامل حال ہوئی تھی یا نہیں؟ ہم تو دیکھتے ہیں کہ ہر ایسے موقع پر اللہ تعالیٰ کی نصرت آپ کے شامل حال رہی اور خدا تعالیٰ کے فرشتے آپ کی مدد کے لئے اترتے رہے۔ کیا حضرت عمرؓ کے

گھر سے تلوار لے کر نکلنے کے وقت خدا تعالیٰ کے فرشتے آپ کی مدد کے لئے اُترے تھے یا نہیں؟ کیا ہجرت حبشہ کے بعد خدا تعالیٰ کے فرشتوں نے اُتر کر مٹھی بھر مسلمانوں کو ظالم کفار کے چنگل میں جانے سے بچایا تھا یا نہیں؟ کیا حضرت ابوبکرؓ کے ہجرت کے ارادہ سے گھر سے نکلنے کے وقت جبکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس باوفا اور پُرانے دوست کی جدائی کا صدمہ ہونے والا تھا خدا تعالیٰ کے فرشتوں کا نزول ہوا تھا یا نہیں؟ اور پھر خدا تعالیٰ نے ایک دشمن اسلام کے دل کو حضرت ابوبکرؓ کو پناہ دینے کے لئے نرم کر دیا تھا یا نہیں؟ اسی طرح طائف سے واپسی کے وقت بھی خدا تعالیٰ کے فرشتہ کا نزول آپ پر ہوا آگے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی فرشتہ کو اجازت نہ دی کہ طائف کی بستی کو تباہ کر دیا جائے ورنہ وہ تو حکم کا منتظر تھا اور آپ کے ذرا سے اشارے کی دیر تھی۔

اس کے بعد ایک اور نظارہ آتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے خود دشمنوں کے ہاتھوں آپ کی حفاظت کے سامان پیدا کر دیئے طائف سے تین میل کے فاصلہ پر مکہ کے ایک رئیس عتبہ بن ربیعہ کا ایک باغ تھا جس میں دیگر پھلدار درختوں کے علاوہ انگور وغیرہ بھی تھا۔ جب طائف کے لوگ آپ کا تعاقب کر کے اور آپ پر پتھر وًا کر کے واپس لوٹ گئے تو آپ اس باغ کے درختوں کے سایہ میں ایک جگہ بیٹھ کر سستانے لگے اُس وقت آپ کا دل بہت بوجھل ہو رہا تھا اِس غم کے ساتھ کہ یہ سفر بھی خالی گیا اور خدا تعالیٰ کی توحید پر ایمان لانے والوں میں اضافہ نہ ہوا۔ پھر آپ کا دل ان زخموں کی وجہ سے بھی بوجھل تھا جو طائف کے اوباشوں کے پتھراؤ کی وجہ سے آپ کے جسم پر پڑ گئے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے انہی کفارِ مکہ کے دلوں کو آپ کے لئے نرم کر دیا جو ہمیشہ آپ کو تکلیفیں دیا کرتے تھے۔ عتبہ اور شیبہ اُس وقت اپنے باغ میں موجود تھے اور انہوں نے دور سے آپ کی ساری حالت دیکھ لی تھی جب انہوں نے یہ دیکھا کہ آپ سخت زخمی حالت میں ایک درخت کے سایہ کے نیچے بیٹھے ہیں تو ان کے دلوں میں دور و نزدیک کی رشتہ داری کا یا کچھ قومی احساس پیدا ہوا اور انہوں نے انگور کے کچھ خوشے توڑ کر ایک طشت میں رکھے اور اپنے ایک عیسائی غلام کے ہاتھ آپ کے لئے بھیجے۔ وہ غلام مذہبًا عیسائی تھا اس نے طشت لا کر آپ کے سامنے رکھ دیا۔ آپ نے بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پڑھ کر انگور

کھانے شروع کئے یہ دیکھ کر عیسائی غلام سخت حیران ہوا اور آپ سے کہنے لگا آپ مکہ کے رہنے والے ہیں؟ آپ نے فرمایا ہاں! وہ کہنے لگا آپ نے پھر **بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم** کہاں سے سیکھی ہے؟ آپ نے فرمایا میں بے شک مکہ کا رہنے والا ہوں مگر میں خدائے واحد کو ماننے والا ہوں۔ پھر آپ نے پوچھا تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ غلام نے کہا میں نینوا کا رہنے والا ہوں۔ آپ نے فرمایا کیا تم اُسی نینوا کے رہنے والے ہو جو خدا کے صالح بندے یونسؑ بن متّٰی کا مسکن تھا؟ عیسائی غلام نے کہا ہاں مگر آپ کو یونسؑ کے متعلق کیسے معلوم ہوا۔ آپ نے فرمایا وہ میرا بھائی تھا کیونکہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کا نبی تھا اور میں بھی اللہ تعالیٰ کا نبی ہوں۔ عیسائی غلام نے کہا اچھا آپ کی تعلیم کیا ہے؟ اس پر آپ نے اسے مختصر طور پر اپنی تعلیم سنائی اور اُسے تبلیغ بھی کی وہ غلام آپ کی باتیں سُن کر ایسا مسحور ہوا کہ جوں جوں آپ باتیں کرتے جاتے تھے اُس کے جذبات اُبھرتے جاتے تھے آخر اس نے آپ کے ہاتھ چومتے ہوئے کہا **یَا رَسُوْلَ اللّٰہ!** میں آپ پر ایمان لاتا ہوں۔ [۲۳] کیونکہ آپ کی تعلیم نبیوں والی ہے عتبہ اور شیبہ دور بیٹھے اس نظارہ کو حیرانگی کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ جب غلام واپس ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے اسے کہا تم نے یہ کیا حرکت کی تھی کہ اس شخص کے ہاتھ چوم رہے تھے۔ اس نے کہا جو تعلیم میں نے اس شخص کی زبانی سُنی ہے وہ نبیوں والی تعلیم ہے۔ پس پیشتر اس کے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں واپس پہنچتے خدا تعالیٰ نے آپ کو ایک موحّد دے دیا اور آپ کے اُس افسوس کو جو سفر طائف کی وجہ سے آپ کو ہوا تھا دور کر دیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے جسمانی پھل (انگور) بھی انہیں دشمنوں کے ہاتھوں سے دیا جو ہمیشہ آپ کو پتھر مارا کرتے تھے اور روحانی پھل (عیسائی) غلام کا ایمان لانا) بھی انہی دشمنوں کے ہاتھ سے دیا گویا وہ غلام جسمانی پھل آپ کو دے گیا اور آپ سے روحانی پھل لے گیا۔ اُس وقت خدا تعالیٰ عرش پر بیٹھا کہہ رہا تھا **اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ** کیا اے محمد ﷺ! تیرے دل میں یہ افسوس تھا کہ اِس سفر میں ایک بھی موحّد نہیں ملا لو میں نے اس افسوس کو دور کرتے ہوئے ایک موحّد تم کو دے دیا اور تیرے دشمنوں کے ہاتھوں سے دیا بے شک وہ موحد ایک غلام تھا مگر وہ دنیا کی نظروں میں غلام تھا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظروں میں وہ غلام نہ تھا بلکہ قیصر و کسریٰ اور اور فراعنہ مصر

بھی اس کے مقابلہ میں کچھ حیثیت نہ رکھتے تھے۔ یہی وہ غلام تھے جن کو لوگ ذلیل سمجھتے تھے مگر جب اسلامی حکومت کا زمانہ آیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسا عروج بخشا کہ بڑے بڑے رؤساء ان کے مقابلہ میں بالکل ہیچ ہو گئے۔

تاریخ میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ اپنی خلافت کے ایام میں جب حج کے لئے مکہ مکرمہ آئے تو مکہ کے بڑے بڑے رؤساء ان کی ملاقات کے لئے حاضر ہوئے۔ حضرت عمرؓ کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ آپ لوگوں کے نسب ناموں کو یاد رکھنے میں بڑے ماہر تھے اور ان کو مکہ والوں کی کئی کئی نسلوں تک کے نام یاد تھے غرض مکہ کے رؤساء آپ کے پاس آتے گئے اور آپ انہیں بٹھاتے گئے حتّٰی کہ ایک لمبی سی قطار بن گئی۔ اس زمانہ میں کوئی بڑے ہال یا بارکیں تو ہوتی نہ تھیں یہی دس دس بارہ فٹ کے کمرے ہوتے تھے اس لئے وہ نوجوان روساء ایک کمرہ میں قطار سی بنا کر بیٹھ گئے تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ انہی غلاموں میں سے ایک غلام حضرت عمرؓ کی ملاقات کے لئے آیا حضرت عمرؓ نے رؤساء کی قطار میں سے ایک کو فرمایا ذرا پیچھے ہٹ جاؤ اور انہیں جگہ دے دو۔ تھوڑی دیر بعد ایک اور غلام آیا تو حضرت عمرؓ نے ایک اور رئیس کو ہٹا کر اس کے بیٹھنے کی جگہ بنائی اسی طرح کئی غلام آئے اور اتنے ہی مکہ کے رؤساء کو کو ہٹا کر ان کے بیٹھنے کی لئے جگہ بنائی حتّٰی کہ رؤساء جوتیوں والی جگہ میں پہنچ گئے اور آخر وہ اس ذلت اور صدمہ کو برداشت نہ کرتے ہوئے وہاں سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور باہر جا کر ایک دوسرے سے کہنے لگے آج تو ہماری بے عزتی کی حد ہو گئی ہے کہ ہمارے مقابلہ میں غلاموں کو ترجیح دی گئی ہے اُن غلاموں کو جو ہمارے باپ دادا کے وقت سے ذلیل اور حقیر چلے آتے تھے اور ہماری جوتیوں میں بیٹھا کرتے تھے۔ ان رؤساء میں ایک سعید الفطرت رئیس بھی تھا وہ کہنے لگا آخر اس میں کس کا قصور ہے جب ہم اور ہمارے باپ دادا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دُکھ دیا کرتے تھے، جب ہم اور ہمارے باپ دادا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ کو روکنے کی کوششیں کیا کرتے تھے، جب ہم اور ہمارے باپ دادا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو انتہائی دُکھوں اور مصیبتوں میں مبتلا رکھتے تھے اور جب ہم نے اور ہمارے باپ دادوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بے وفائی کا سلوک کیا اُس وقت یہی غلام تھے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وفادار رہے اس لئے

اب جبکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت قائم ہو چکی ہے یہی لوگ معزز اور مکرم سمجھے جانے کے حق دار ہیں نہ کہ ہم۔ وہ کہنے لگے اب ہماری اس غلطی کا کوئی علاج بھی ہوسکتا ہے یا نہیں؟ وہ رئیس کہنے لگا اِس کے متعلق حضرت عمرؓ سے ہی پوچھنا چاہئے چنانچہ یہ لوگ دوبارہ حضرت عمرؓ کے پاس گئے اور عرض کیا کہ ہم آپ سے ایک بات کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا میں آپ لوگوں کی بات کو سمجھ گیا ہوں مگر مجھے افسوس ہے کہ جو سلوک میں نے آپ کے ساتھ کیا ہے اِس کے کرنے کے لئے میں مجبور تھا یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ جو لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں معزز تھے میں آپ کا غلام ہو کر انہیں مکرم اور معزز نہ سمجھتا۔ پس میں نے آپ لوگوں کے ساتھ جو کچھ کیا وہ مجبور ہو کر کیا ہے۔ وہ کہنے لگے ہم بھی اس بات کو سمجھ چکے ہیں مگر آپ یہ بتائیں کہ کیا ہماری اور ہمارے باپ دادوں کی اس غلطی کا ازالہ کسی طرح ہوسکتا ہے اور کیا اس بدنما داغ کو کسی طرح دور کیا جا سکتا ہے؟ یہ سن کر حضرت عمرؓ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور آپ رقت کی وجہ سے زبان سے تو ان کو کوئی جواب نہ دے سکے مگر ہاتھ اُٹھا کر شمال کی طرف اشارہ کر دیا جہاں اُن دنوں عیسائیوں سے مسلمانوں کی جنگ ہو رہی تھی۔ آپ کے اشارہ کا مطلب یہ تھا کہ تم لوگ اب اسلامی جنگوں میں شامل ہو کر دشمن کے مقابلہ میں نکلو اور اپنے خون بہا کر اِس داغ کو دور کرو۔ چنانچہ تاریخوں میں آتا ہے کہ وہ رؤساء اس مجلس سے اُٹھتے ہی اپنی اپنی سواریوں پر سوار ہو کر شام کی طرف چلے گئے اور ان میں سے ایک بھی زندہ واپس نہ لوٹا۔[۲۴] غرض غلاموں کو اسلام میں بڑا مقام حاصل ہوا اور اس نے انہیں عزت اور شرف کے ایک بہت بڑے مینار پر کھڑا کر دیا۔

ابوسفیان جب ایمان لایا اور مدینہ میں گیا تو اپنی ریاست کے غرور میں اس نے بعض نازیبا باتیں ایک مجلس میں کہہ دیں جس پر مدینہ کے لوگوں نے جن میں بعض غلام بھی تھے ابوسفیان کے خلاف کچھ باتیں کہیں۔ جب یہ باتیں ہو رہی تھیں تو حضرت ابوبکرؓ کہیں پاس سے گزر رہے تھے وہ باتیں سن کر کھڑے ہو گئے اور ان لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا تم لوگ جانتے نہیں یہ شخص (ابوسفیان) مکہ کا بہت بڑا رئیس ہے۔ اس کے بعد اس خیال سے کہ مدینہ والوں کی باتوں کی وجہ سے ابوسفیان کی دل شکنی نہ ہو اور یہ باتیں سن کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی

ناراض نہ ہو جائیں حضرت ابوبکرؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یَـا رَسُـوْلَ اللّٰـه! میں فلاں جگہ سے گزر رہا تھا تو میں نے سنا کہ فلاں فلاں ابتدائی ایمان لانے والوں نے (حضرت ابوبکرؓ نے چند غلاموں کا نام لیا) ابوسفیان کے متعلق بعض سخت الفاظ کہے ہیں حضرت ابوبکرؓ کا تو یہ خیال تھا کہ آپ ان ہتک کرنے والوں کو ڈانٹیں گے مگر آپ کے چہرے پر ناراضگی کے آثار پیدا ہوئے اور آپ نے فرمایا ابوبکر! اگر تم نے کوئی بات کہہ کر اُن کا دل دُکھایا ہے تو تم نے ان کا دل نہیں دکھایا بلکہ خدا تعالیٰ کا دل دُکھایا ہے اور اگر وہ تم پر نارض ہیں تو خدا تعالیٰ بھی تم پر ناراض ہے۔ حضرت ابوبکرؓ اُسی وقت اُٹھ کر اس مجلس میں گئے اور ان لوگوں سے پوچھا کہ آپ مجھ پر ناراض تو نہیں ہیں؟ اور جب انہوں نے کہا کہ نہیں نہیں ناراضگی کی کیا بات ہے تو حضرت ابوبکرؓ کو تسلی ہوئی۔[25]

غرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب کی وجہ سے غلام غلام نہ رہے تھے بلکہ وہ دوسرے رؤساء سے بھی بڑھ کر معزز اور مکرم ہو گئے تھے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو وہ اعزاز بخشا جو عرب کے بڑے بڑے رؤساء کو بھی حاصل نہ تھا۔ جب فتح مکہ کے وقت آپ شہر میں داخل ہوئے تو آپ نے فرمایا جو شخص خانہ کعبہ میں داخل ہو جائے گا اسے پناہ دی جائے گی، جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا اسے بھی امن دیا جائے گا پھر آپ نے اسلامی جھنڈا ایک شخص کے ہاتھ میں دے کر فرمایا یہ بلالؓ کا جھنڈا ہے جو شخص بلالؓ کے جھنڈے کے نیچے آجائے گا اُس کو بھی امن دیا جائے گا۔[26] یہ وہی بلالؓ تھا جسے وہ لوگ تپتی ہوئی ریت پر لٹایا کرتے تھے، جسے مکہ کے پتھریلے میدان میں گرم پتھروں پر ننگا کر کے لٹا دیتے تھے اور سینے پر پتھر رکھ دیتے تھے، جسے وہ لوگ ٹانگوں میں رسہ ڈال کر شہر کے شریر اور اوباش نوجوان اور بچوں کے حوالے کر دیا کرتے تھے اور وہ ان کو مکہ کی گلیوں میں گھسیٹا کرتے تھے، یہ وہی بلال تھے جنہیں مکہ کے لوگ حبشی غلام ہونے کی وجہ سے سخت ذلیل سمجھا کرتے تھے مگر اب اسلام میں داخل ہو جانے کی وجہ سے بلالؓ کو وہ مقام اور رُتبہ حاصل ہوا کہ وہی بلالؓ کو ذلیل سمجھنے والے لوگ اس طرح امان پا سکتے تھے کہ وہ بلال کے جھنڈے کے نیچے آجائیں۔ پس جب طائف کی بستی والوں نے کہا ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کو تیار نہیں تو اللہ تعالیٰ نے

آپ کو خالی ہاتھ واپس نہیں بھیجا بلکہ یونس بن متیٰ پر ایمان لانے والا ایک شخص آپ کو دے دیا اور اس نے آپ کو ہی انگور نہ کھلائے بلکہ خود بھی آپ سے روحانی انگور کھا کر واپس ہوا۔ اُس وقت عرش پر خدا تعالیٰ کہہ رہا تھا اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ اے محمد! تو یہ خیال کر رہا تھا کہ اِس سفر میں توحید کے ماننے والوں میں اضافہ نہیں ہوا مگر کیا ہم نے تجھے ایک مخلص اور باوفا آدمی دیا یا نہیں دیا۔

اس کے بعد ایک اور شاندار نظارہ ہمیں نظر آتا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس باغ میں تھوڑی دیر تک آرام فرمانے کے بعد وہاں سے روانہ ہوئے اور نخلہ میں پہنچے جو مکہ سے ایک منزل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ وہاں کچھ دن قیام کرنے کے بعد آپ نے مکہ جانے کا ارادہ کیا مگر مکہ والوں کا یہ قانون تھا کہ ایک دفعہ جو شخص شہر کو چھوڑ جاتا تھا اُس کے شہریت کے حقوق بھی جاتے رہتے تھے۔ یعنی جب تک کوئی شخص مکہ کو چھوڑ کر نہیں جاتا تھا اسے سیٹزن (Citizen) یعنی شہریت کے حقوق حاصل ہوتے تھے مگر شہر کو ایک دفعہ چھوڑ جانے کے بعد جبکہ شہر کے لوگ اس سے ناراض ہوں اُس کے وہ حقوق چھن جاتے تھے اور دوبارہ اُس شہر میں آنے پر وہ حقوق اُسے اس وقت تک نہ مل سکتے تھے جب تک قانون اُسے اِس کی اجازت نہ دے اور وہ قانون یہ تھا کہ شہر کا کوئی رئیس اُسے اپنی حفاظت میں لے لے۔ چنانچہ آپ نے اِس قانون پر عمل کیا اور حضرت زیدؓ کو مکہ کے ایک رئیس مطعم بن عدی کے پاس بھیجا اور کہلا بھیجا کہ میں مکہ میں دوبارہ داخل ہونا چاہتا ہوں کیا تم اس کام میں میری مدد کر سکتے ہو؟ آپ نے کسی ایسے شخص کو پیغام نہ بھیجا جو مخالفت میں پُر جوش نہ تھا بلکہ اس شخص کو پیغام بھیجا جو اسلام کا اشد ترین مخالف تھا اگر کوئی مرنجان مرنج آدمی ہوتا تو لوگ سمجھتے کہ وہ نرم دل آدمی تھا اس لئے اس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی حفاظت میں لے کر مکہ میں داخل کر لیا مگر مطعم بن عدی اسلام کا سخت مخالف تھا مگر ساتھ ہی یہ بات بھی تھی کہ ایسے حالات میں پناہ دینے سے انکار کرنا شرفائے عرب کی فطرت کے خلاف تھا چنانچہ جب حضرت زیدؓ نے مطعم بن عدی سے کہا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہاری طرف پیغام بھیجا ہے کہ کیا تم مجھے اپنی حفاظت میں لے کر مجھے شہری حقوق دلا سکتے ہو؟ تو وہ بلا حیل وحجت کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنے تمام بیٹوں کو جمع کیا اور وہ سب مسلح

ہو کر خانہ کعبہ کے پاس کھڑے ہوگئے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہلا بھیجا کہ آپ آ جائیں۔ آپ تشریف لائے اور پہلے خانہ کعبہ کا طواف کیا اور پھر وہاں سے مطعم بن عدی اور اس کے بیٹوں کی تلواروں کے سایہ میں اپنے گھر میں داخل ہوگئے۔ اس موقع پر مطعم بن عدی نے اپنے بیٹوں سے کہا یاد رکھو جب تک تمہارے جسموں کے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جائیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی قسم کی گزند نہ پہنچنے پائے ساتھ ہی اُس نے مکہ میں اعلان کر دیا کہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو شہری حقوق دیتا ہوں پس جس وقت شہری حقوق کا سوال آیا اور مکہ والے نہ چاہتے تھے کہ آپ دوبارہ شہر میں داخل ہوں اُس وقت خدا تعالیٰ نے ایک شدید ترین دشمن کے ذریعہ آپ کو مکہ میں داخل کیا اور بتا دیا کہ اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! کیا میں اپنے بندے کے لئے کافی نہیں ہوں؟

(الفضل ۲۳ر اگست ۵، ۷، ۸، ۹، ۱۳، ۱۴، ۱۶، ۱۷، ۱۸ر نومبر ۱۹۶۱ء)

---

۱ الزمر: ۳۷

۲ تذکرہ صفحہ ۲۵۔ ایڈیشن چہارم

۳ زبور باب ۱۱۸ آیت ۲۲۔ نارتھ انڈیا بائبل سوسائٹی مرزا پور ۱۸۷۰ء

۴ سیرت ابن ھشام جلد ۱ صفحہ ۱۷۱ تا ۱۷۳ مطبوعہ مصر ۱۹۳۶ء

۵

۶ سیرت ابن ھشام جلد ۱ صفحہ ۲۰۰۔ ۲۰۱ مطبوعہ مصر ۱۹۳۶ء

۷ القصص: ۱۵ ۸ الاحقاف: ۱۶ ۹ العلق: ۲ تا ۶

۱۰ بخاری کتاب بدء الوحی باب کیف کان بدء الوحی (الخ)

۱۱ سیرت ابن ھشام جلد ۱ صفحہ ۲۶۲ تا ۲۶۵ مطبوعہ مصر ۱۹۳۶ء

۱۲ سیرت ابن ھشام جلد ۱ صفحہ ۲۶۹ مطبوعہ مصر ۱۹۳۶ء

۱۳ سیرت ابن ھشام جلد ۱ صفحہ ۳۳۹۔ ۳۴۰ مطبوعہ مصر ۱۹۳۶ء

۱۴ بخاری کتاب مناقب الانصار باب ھجرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم و اصحابہ (الخ)

۱۵ سیرت ابن ھشام جلد ۱ صفحہ ۳۱۱۔ ۳۱۲ مطبوعہ مصر ۱۹۳۶ء

۱۶؎

۱۷؎ طٰہٰ: ۱۵

۱۸؎ السیرة الحلبیة الجزءالاوّل صفحہ ۳۶۸۔ مطبوعہ مصر ۱۹۳۲ء

۱۹؎ سیرت ابن ھشام جلد ا صفحہ ۲۸۵ مطبوعہ مصر ۱۹۳۶ء

۲۰؎ السیرة الحلبیة جلد ا صفحہ ۳۸۳ مطبوعہ مصر ۱۹۳۲ء

۲۱؎ سیرت ابن ھشام جلد ۲ صفحہ ۱۶، ۱۷ مطبوعہ مصر ۱۹۳۶ء

۲۲؎ مسلم کتاب الجهاد باب مالقی النبی صلی الله علیه وسلم من اذی (الخ)

۲۳؎ سیرت ابن ھشام جلد ۲ صفحہ ۶۲ مطبوعہ مصر ۱۹۳۶ء

۲۴؎ اسد الغابة جلد ۲ صفحہ ۲۷۳ مطبوعہ ریاض ۱۲۸۵ھ

۲۵؎

۲۶؎

۲۷؎ طبقات ابن سعد جلد ا صفحہ ۲۱۲ مطبوعہ بیروت ۱۹۸۵ء